يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شعبان المعظم

اختتام سحر اور اذان فجر
ایک تحقیقی مقالہ (دیوانہ کے قلم سے)

قبر سے حصول فیض
کرنل (ر) الطاف محمود ہاشمی کی منفرد تحریر

مسائل شرعیہ اور ان کا حل
مفتی رضائے المصطفیٰ ظریف القادری

منبہ الحق فی کشف ظلمات زبیر علی زئی (2)
غیر مقلد حافظ زبیر علی زئی کے شبہات کا ازالہ

مسائل روزہ

اسلام میں گداگری کی ممانعت
از قلم علامہ پیر تبسم بشیر اویسی

محدث بریلوی پر اعتراض کا جواب
ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی

"زبدۃ التحقیق" کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ
فیصل خان کا علمی مقالہ

اَلتَّحْقِیْقَاتُ الْاِسْلَامِیَہ فَاؤُنْڈیشَنْ

مکتب و سلسلہ

نوٹ: نفس مضمون کی تمام تر ذمہ داری مضمون نگار پر ہوگی

Email:alburhanwah@gmail.com
Email:zaf.wah786@gmail.com

مکتبہ فیضان سنت دکان نمبر 28 سیلاد چوک واہ کینٹ
0343-5942217
0302-5122663

فہرست

اداریہ

صدائے دل

ہماری پالیسی

اہل سنت و جماعت کے عقائد و معاملات میں سلف صالحین اور امام اہل سنت مجدد دین وملت الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ کی تحقیقات ،تصریحات ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ہر معاملے اور ہر مسئلے میں ہم ان کی تعلیمات کو مقدم رکھیں گے۔ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے بعد ان کے خلفاء اور تلامذہ کی تحقیقات سے بھی ہم ضرور رہنمائی لیں گے۔

دور حاضر میں اہل سنت و جماعت کے اندر گروپ بندی کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس میں اگر ہم کسی مسئلہ پر کسی کا موقف سلف صالحین اور امام اہل سنت کے خلاف پائیں گے تو اس پر اہل سنت کا موقف دلائل و براہین کے ساتھ ضرور پیش کریں گے۔ مجلہ میں اگر کوئی ایسی تحریر شائع ہوگئی جو کہ قابل گرفت ہو تو اس کی نشاندہی ہونے پر ہم معذرت کرنے میں کبھی بھی نہیں ہچکچائیں گے۔ مجلہ میں شامل کسی بھی مضمون سے اگر کسی کو علمی اختلاف ہو تو اس کے جواب کے لیے ہمارے صفحات حاضر ہیں۔ بدمذہبوں کے عقائد کا رد کرتے ہوئے ہم تہذیب و متانت کا دامن ہرگز نہیں چھوڑیں گے بلکہ دلائل و براہین سے ان کا ابطال کریں گے اور اپنے مسلک کی حقانیت کو واضح کریں گے۔

اسے کیا کہیے؟

ایبٹ آباد میں امریکہ نے ایک فوجی اپریشن کے دوران اسامہ بن لادن کو ہلاک کر دیا ہے۔ ہم نہ صرف امریکہ بلکہ ہر اس تنظیم ،گروہ اور ایسے تمام لوگ جو بے گناہ مسلمانوں کا خون بہانے میں شامل ہیں ان کی مذمت کرتے ہیں۔ اللہ کریم ان سب کو ہدایت عطا فرمائے اور اگر

ہدایت ان کے نصیب میں نہیں ہے تو ان کو تباہ و برباد فرمائے۔

ہمارے ایک معاصر مجلّہ کے مدیر محترم نے اپنے مجلّہ کے اداریہ میں اُسامہ بن لادن کی ہلاکت کے حوالے سے لکھا ہے کہ ! ''اُسامہ کو امریکی فوجی ہلاک نہ کرتے تو بالیقین بیماریاں انہیں ہلاک کر دیتیں مگر اللہ نے اُسامہ کی قسمت میں بستر پر نہیں بلکہ امریکی قذاقوں کے ہاتھوں شہادت کی موت لکھی تھی جو کہ منصب عظیم ہے اور یہ بھی زندہ حقیقت ہے کہ جب تک امریکی وصیہونی دہشتگردی جاری رہے گی تب تک اُسامہ جیسے جانباز جنم لیتے رہیں گے۔۔۔۔۔۔ کبھی بصورت حسین، کبھی بصورت صلاح الدین ایوبی، کبھی بصورت ٹیپو سلطان، کبھی بصورت فضل حق خیر آبادی اور کبھی بصورت اُسامہ بن لادن پھر اچانک آواز گونجے گی جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا''۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ اُسامہ بن لادن شہید ہے یا نہیں۔ نہ ہم بعض دانشوروں کی اس بات کو موضوع سخن بنانا چاہتے ہیں کہ اُسامہ بن لادن کے کردار سے عالم اسلام کو کیا فائدہ پہنچا اور انہوں نے اسلام کی کون سی خدمت سرانجام دی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ دہشت گردی کو اسلام کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں مسلمان غیر مسلموں کی نظر میں نفرت کا نشان بن گئے ہیں۔ لیکن ہمیں گلہ ہے کہ ہمارے ملک پاکستان کے اندر علماء اور مشائخ اہل سنت کو شہید کیا گیا۔ ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔ ہمارے مدارس اور مساجد کو خودکش حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن اُسامہ بن لادن یا اس کے ساتھیوں کی طرف سے ایک دفعہ بھی نہ تو ان حملوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا اور نہ ہی ان کی مذمت کی گئی۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ مدیر موصوف نے نہ صرف اُسامہ بن لادن کو شہید قرار دیا ہے بلکہ ان کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، صلاح الدین ایوبی، فضل حق خیر آبادی جیسے مجاہدین اسلام کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ فیا للعجب!

ٹوٹتے بنتے اتحادوں میں رہ رہ کر لگتا ہے کہ بعض لوگ اپنی فکر بھی گنوا بیٹھے ہیں اور کوا چلا

ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا کے مصداق بن گئے ہیں۔

اہل سنت میں انتشار

اگرچہ انتشار تو دیگر مکاتب فکر کے اندر بھی ہر طرح کا اور ہر سطح پر موجود ہے لیکن اہل سنت کے اندر تو اس کے اثرات کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگے ہیں اور بجائے کم ہونے کے یہ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ تنظیمی انتشار تو پہلے سے ہی موجود تھا۔ اب فکری انتشار بھی آہستہ آہستہ سامنے آرہا ہے۔ اگر اکابر علماء ومشائخ نے اس طرف توجہ نہ دی اور اسے ختم کرنے کی سنجیدہ کوششیں نہ کیں تو نہ صرف یہ کہ انتشار مزید بڑھے گا بلکہ باقاعدہ ایک نیا طبقہ فکر بن جائے گا جو آگے چل کر ناقابل تلافی نقصان کا باعث بنے گا۔

اندرونی چپقلش اور انتشار کی وجہ سے ملکی سطح پر مختلف معاملات میں ہماری کوئی آواز اور موقف سامنے نہیں آسکتا۔ اگر کوئی موقف سامنے آتا بھی ہے تو اس میں وہ قوت نہیں ہوتی جو کہ مقتدر قوتوں کو متوجہ کر سکے۔ قد آور شخصیات کا میدان میں نہ ہونا یا جو میدان میں موجود ہیں ان کا اپنی شخصیت کو منوا نہ سکنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ لیکن ہم بول کر اپنے دل اور ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔

اہل سنت وجماعت میں اتحاد ویکجہتی کی جتنی اس وقت ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ یہ اتحاد ویکجہتی فکری وتنظیمی سطح پر انتہائی ناگزیر ہو چکا ہے۔ تنظیمی انتشار سے پہلے فکری انتشار کا خاتمہ انتہائی ضروری ہے۔ گذشتہ دہائی میں کچھ نئے افکار نے راہ پائی ہے۔ جن کا پہلے وجود نہیں تھا یا اگر وجود تھا تو کوئی اہمیت وحیثیت نہ تھی۔ لیکن اب بعض اہل علم کی طرف سے ان کو پروان چڑھانے کی کاوشیں ہو رہی ہیں اور بات مناظروں تک جا پہنچی ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ عقائد ومعاملات میں نت نئے امام نہ بنائے جائیں بلکہ سلف صالحین اور امام اہل سنت امام الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ جیسی آفاقی اور متفقہ شخصیات کی تعلیمات وافکار کو ہی مشعل راہ بنایا جائے۔ خصوصاً عقائد کے معاملات میں جو چیزیں سلف صالحین اور امام احمد رضا خان

محدث بریلوی علیہ الرحمہ تک متفق علیہ ہیں ان کو قطعاً نہ چھیڑا جائے۔ فروعی مسائل میں بھی اگر حالات حاضرہ کے تناظر میں اختلاف کرنا ناگزیر ہو جائے تو ہرایرا غیرا اختلاف کرنے نہ بیٹھ جائے بلکہ مستند و معتبر علماء کی ایک جماعت یہ فریضہ سرانجام دے ورنہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچے گی۔

تنظیمی انتشار کے حوالے سے عرض ہے کہ سب سے پہلے تمام تنظیموں کے عہدیدار اپنی انا کو ختم کریں اور ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس بات پر تیار کریں کہ ہر حال میں ہم نے متحد ہونا ہے۔ اس بات کا تہیہ کریں کہ دوسروں کی ترقی اور کامیابی کا زینہ بننے کے بجائے اپنوں کی ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ اس کے بعد انتہائی اجلہ علماء و مشائخ جن کو ہر سطح پر احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اتفاق رائے سے ان پر مشتمل ایک سپریم کمیٹی بنائی جائے۔ کمیٹی کے بن جانے کے بعد تمام تنظیموں کے عہدیدار مستعفی ہو جائیں۔ اس کے بعد کمیٹی انتخابات کرا کے تمام ذمہ داریاں منتخب عہدیداروں کو سونپ دے۔ انتخاب سے پہلے تمام امیدواروں سے یہ حلف لے لیا جائے کہ وہ نتائج کو تسلیم کریں گے۔ اس کے بعد جو انتشار پھیلانا چاہے اس سے ہر سطح پر بائیکاٹ کیا جائے۔ اس طریقہ سے اگر جمعیت علماء پاکستان اور جماعت اہل سنت پاکستان کا نیا ڈھانچہ اتفاق رائے سے وجود میں آ جائے تو غنیمت ہوگا۔

ع شاید کے اتر جائے تیرے دل میں میری بات

انبیاء کرام کی توہین کیوں؟

کیبل پر موجود ایک ٹی وی چینل آج کل یوسف علیہ السلام کے بارے میں ایک فلم دکھا رہا ہے جس میں دو اداکار یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کا کردار ادا کر رہے ہیں جو کہ سراسر ان انبیاء کرام کی توہین ہے۔ لہٰذا خود بھی یہ فلم دیکھنے سے اجتناب کریں۔ اپنے اہل خانہ اور بچوں کو بھی اس سے دور رکھیں کیونکہ یہ شرعاً ناجائز ہے۔

مدیر اعلیٰ افضل شاہد اعوان

تحریر: ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شعبان المعظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

"ان عدة الشهور عند الله اثنا عشر اشهراً فی کتاب الله"۔ (سورۃ توبہ آیت ۳۶) ترجمہ: بے شک مہینوں کی گنتی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ان بارہ مہینوں میں ترتیب کے لحاظ سے آٹھواں مہینہ شعبان المعظم ہے جو کہ رجب المرجب اور رمضان المبارک کے درمیان ہے جیسا کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے!

"عن اسامه بن زيد قال قلت يا رسول الله ﷺ لم ارك تصوم شهراً من الشهور مات صوم من شعبان قال ذالك شهر يغفل الناس عنه بين رجب و رمضان وهو شهر يرفع فيه الاعمال الى رب العالمين فاحب ان يرفع عملى وانا صائم"۔

ترجمہ: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں آپ کو تمام مہینوں سے زیادہ شعبان المعظم میں روزہ رکھتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وہ مہینہ ہے جس سے لوگ غافل ہیں۔ (یعنی اس کی شان وفضیلت سے) رجب اور رمضان کے درمیان یہ وہ مہینہ ہے جس میں (بندگان خدا کے) اعمال رب العالمین کی بارگاہ میں اٹھائے جاتے ہیں۔ پس میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جب میرا عمل اٹھایا جائے تو میں حالت روزہ میں ہوں۔ (سنن نسائی مترجم ۲/۱۰۸ رقم ۲۳۶۱، سنن الکبری بیہقی ۳/۱۷۷ رقم ۲۶۷۹، مسند احمد ۵/۲۰۱، مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۹۳۶، مسند البزار ۱/۶۹، شرح معانی الآثار طحاوی ۲/۸۲)

۱) اس حدیث کی امام ابن خزیمہ نے تصحیح فرمائی۔ (فتح الباری ۵/۲۲۹)

۲) غیر مقلدین کے علامہ ناصر الدین البانی نے اس کو حسن کہا۔ اور احادیث الصحیحہ ۴/۵۲۲ رقم

۱۸۹۸ میں ذکر کیا۔

۳) غیر مقلدین کے مولانا ارشاد الحق اثری نے بھی اسکو حسن کہا۔ دیکھئے: (تبیین العجب بما ورد فی فضل رجب ۴۳ حاشیہ نمبر ۱۴)

شعبان المعظم کی وجہ تسمیہ:

امام بدرالدین عینی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں!

''اور شعبان شعب سے مشتق ہے۔ اور وہ اجتماع ہے۔ اس کے نام کی وجہ یہ ہے کہ اس میں خیر کثیر رمضان المبارک کی طرح جمع کی جاتی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ متفرق ہونے کے بعد اس میں جمع ہوتے تھے۔ اور وہ وہ جمع ہوتے تھے یا کئی۔ اور ابن دید نے کہا اس لیے اس کا نام رکھا گیا ہے کہ وہ پانی کی طلب میں جدا جدا ہونے کے بعد اس میں جمع ہوتے تھے۔ اور محکم میں ہے ان کے غاروں میں جمع ہونے کی وجہ سے اس کا نام رکھا گیا ہے۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری ۱۱/۱۱۲)

غنیۃ الطالبین میں ہے کہ!

''شعبان میں پانچ حروف ہیں: ش: شرف کا ہے۔ ع علو کا۔ ب: بر کا ہے۔ الف، الفت کا ہے۔ اور ن، نور کا ہے۔ اس مہینے میں یہ پانچوں حروف بارگاہ الٰہی سے بندے کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ اس ماہ میں نیکیوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ خطاؤں کو معاف کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر درود کی کثرت کی جاتی ہے۔ (غنیۃ الطالبین مترجم ۳۴۱)

تحویل قبلہ کا مہینہ:

امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ اسی ماہ مقدس میں کعبہ کو اُمت محمدیہ کے لیے قبلہ مقرر کیا گیا۔ ''قال ابو حاتم رضی اللہ عنہ: صلی المسلمون الی بیت المقدس بعد قدوم المصطفی ﷺ المدینۃ سبعۃ عشر شھر او ثلاثۃ ایام سواء وذلک أن

قدو ﷺ المدینة کان یوم الاثنتین لا ثنتی عشرۃ لیلة خلت من ربیع الاول وأمرہ اللہ جل و علا باستقبال الکعبة یوم الثلاثاء لنصف من شعبان۔(صحیح ابن حبان ۲/۶۲۰ تحت حدیث ۱۷۱۶، تفسیر قرطبی ۲۵/۱۵۰ تحت آیت قد نری تقلب وجهك۔۔۔الخ)

ترجمہ: ابو حاتم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مسلمانوں نے بیت المقدس کی طرف سترہ مہینے اور تین دن تک حضور ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد نمازیں پڑھیں۔ اور پیر کے دن بارہ راتیں گزرنے کے بعد ربیع الاول شریف کے مہینہ میں (نبی ﷺ) نے مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے استقبال کعبہ کا حکم پندرہ شعبان بروز منگل کو دیا۔

درود کی کثرت کا مہینہ:

حضور ﷺ پر درود پڑھنے کا حکم اسی ماہ مقدس میں نازل ہوا۔ امام سخاوی فرماتے ہیں!''أن الأمر بالصلاۃ علی النبی ﷺ کان فی السنة الثانیه من الهجرۃ وقیل فی لیلة الاسرا''۔(القول البدیع ص ۱۹۹ الباب الاول)

ترجمہ: نبی ﷺ پر درود بھیجنے کا حکم ۲ ہجری میں نازل ہوا اور کہا گیا ہے کہ یہ لیلۃ الاسراء میں نازل ہوا۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا!''جس نے ہر شعبان کے دن میں نبی اکرم ﷺ پر سات سو مرتبہ درود شریف پڑھا تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے فرشتوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہے کہ وہ درود شریف آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرتے اور پہنچاتے ہیں۔ جس سے نبی اکرم ﷺ کی روح مبارکہ خوشی و مسرت کا اظہار فرماتی ہے۔ پھر (اللہ تعالیٰ) ان فرشتوں کو حکم فرماتا ہے کہ وہ قیامت تک اس شخص کے لیے استغفار کرتے رہیں۔(القول البدیع ص ۲۱۴)

حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں!''اھل السنة کی علامت ہے نبی ﷺ پر کثرت سے درود پڑھنا۔(القول البدیع ص ۱۳۲)

پندرہ شعبان کی رات:

شعبان المعظم میں ایک رات ایسی ہے جس کو عام طور پر شب برأت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ رات شعبان المعظم کی پندرھویں رات ہے۔ اور عام بلاد اسلامیہ میں مسلمان اس رات میں عام راتوں کی نسبت زیادہ عبادت خداوندی میں مشغول ہوتے ہیں۔ اور اس رات کو عظمت و فضیلت والی رات جانتے ہیں۔ مگر آج کل کچھ لوگ اس کی فضیلت کے قائل کو بدعتی کہتے ہیں۔ جو سراسر ظلم اور جہالت ہے۔ آیئے دیکھیں اس رات کی عظمت کیا ہے۔ کسی چیز کے ناموں کی کثرت بھی اس کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ جو نام علماء سے ثابت ہیں وہ ذکر کیے جاتے ہیں۔

۱۔لیلۃ البراۃ ۲۔اللیلۃ المبارکۃ ۳۔لیلۃ الصک

۴۔لیلۃ الرحمۃ۔(تفسیر الکشاف ۳/۲۲۲)(اللباب فی علوم الکتاب ۱۷/۳۰۹)

۵۔لیلۃ التکفیر ۶۔لیلۃ القسمۃ ۷۔لیلۃ الاجابۃ ۸۔لیلۃ عید الملائکۃ

۹۔لیلۃ الشفاعۃ ۱۰۔لیلۃ التقدیر ۱۱۔لیلۃ التعظیم ۱۲۔لیلۃ الغفران

۱۳۔لیلۃ الحیاۃ ۱۴۔لیلۃ الجائزہ ۱۵۔لیلۃ الرجحان۔(همیان الزاد للاباضی تحت الدخان آیت نمبر ۳، کتاب تحفۃ الاخوان فی قراۃ المیعاد، ص ۸۶،۸۷، الکلمات الحسان ص ۱۶)

اہل ایمان والوں کے لیے پندرھویں شعبان کی رات تحفہ ہے:

یہ وہ رات ہے جس کے بارے میں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا عن معاذ بن جبل عن النبی ﷺ قال یطلع الله الی خلقه لیلة النصف من شعبان فیغفر لجمیع خلقه، الا لمشرك أو مشاحن۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے پس مشرک اور کینہ پرور کے سوا ہر ایک کی مغفرت فرما دیتا ہے۔ (صحیح ابن حبان جلد ۱۲ ص ۴۸۱ رقم الحدیث ۵۶۶۵ طبرانی معجم

الکبیر جلد ۲۰ ص ۱۰۸، مسند الشامیین جلد ا ص ۱۲۸، شعب الایمان بیہقی جلد ۵ ص ۳۶۰، حلیۃ الاولیاء جلد ۵ ص ۱۹۱، ابن ابی عاصم فی السنۃ جلد ا ص ۲۲۳)

امام ھیثمی فرماتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔(مجمع الزوائد ۸/۶۵)

اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت ابوھریرہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عوف، حضرت ابو ثعلبہ، حضرت ابو اُمامہ باہلی، حضرت کثیر بن مرہ رضی اللہ عنھم سے اسی قسم کے مضمون کی روایات ہیں۔

امام طاؤس یمانی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے پندرہ شعبان کی رات اور اس میں عمل کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا! ''میں اس (رات) کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ایک حصہ میں نانا جان ﷺ پر درود شریف پڑھتا ہوں۔اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کہ اس نے حکم فرمایا!! اے ایمان والو نبی ﷺ پر درود اور سلام پڑھو جیسا اس کا پڑھنے کا حق ہے۔اور دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے کہ اس نے حکم فرمایا!! یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کو عذاب دے حالانکہ وہ استغفار کرتے ہوں''۔(سورۃ الانفال ۳۳)

تیسرے حصے میں نماز پڑھتا ہوں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر عمل کرتے ہوئے'' سجدہ کر اور قرب حاصل کر''۔

میں نے عرض کیا جو شخص یہ عمل کرے اس کے لیے کیا ثواب ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ! میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا۔اور انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! کہ جس نے پندرہ شعبان کی رات کو زندہ کیا اس کو'' مقربین'' یعنی ان لوگوں میں کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا!'' فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ ''(سورۃ الواقعۃ ۸۸) میں لکھ دیا جاتا ہے۔(القول البدیع :امام سخاوی، ص ۲۱۴،۲۱۵)

سال بھر مرنے والوں کے فیصلے کی رات:

حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں!

''انه ليس نفس تموت في سنة الا كتب أجلها في شعبان و أحب أن يكتب أجلي وأنا في عبادة ربي و عمل صالح ''۔(تاریخ بغداد ۲۳۵،۲۳۴/۴)

ترجمہ: کوئی جان ایسی نہیں جس نے اس سال مرنا ہو مگر اس کی موت شعبان میں لکھ دی جاتی ہے۔ پس میں محبوب رکھتا ہوں کہ جب میری اجل لکھی جائے تو میں اپنے رب کی عبادت اور عمل صالح میں ہوں۔

دوسری روایت میں ہے!

''رسول اللہ ﷺ شعبان المعظم سے بڑھ کر کسی ماہ کے روزے نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ اس میں زندوں کی روحوں کو مردوں میں لکھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک آدمی شادی کرتا ہے جبکہ اس کا نام مرنے والوں میں اوپر لکھا ہوتا ہے''۔(تاریخ ابن عساکر ۲۵۰/۶۱)

یہ دونوں روایات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہیں۔ جبکہ اسی مضمون کی روایات حضرت ابو ھریرہ، حضرت راشد بن سعید رضی اللہ عنہما سے بھی ہیں۔

عبادت کی رات:

اس رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بندے اس سے بخشش کی امید رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے!''عن واثلة بن الاسقع قال سمعت رسول الله ﷺ يقول قال الله تبارك و تعالىٰ أنا عند ظن عبدي بي فليظن بي ما شاء''۔

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔ جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے۔ پس وہ جو چاہے میرے بارے میں گمان رکھے۔(صحیح ابن حبان ۴۰۱/۲، مستدرک

حاکم ۱۶۶/۵ ،سنن دارمی ۳۹۵/۲ ،مسند احمد ۳۹۲/۳ رقم ۱۶۱۱۲ ،معجم الکبیر ۸۸/۲۲)

بخشش کی راتیں:

عن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من احیا اللیالی الخمس وجبت لہ الجنۃ۔لیلۃ الترویۃ، ولیلۃ عرفۃ، ولیلۃ الفطر، ولیلۃ النحر، ولیلۃ النصف من شعبان۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے پانچ راتوں کو زندہ کیا (بیدار ہو کر عبادت کی) اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔تو یہ راتیں آٹھ ذی الحجہ کی رات، عرفہ کی رات، عید الفطر کی و قربانی کی رات اور پندرہ شعبان کی رات۔(الترغیب والترہیب للاصبہانی ۲۴۸/۲ ،الترغیب والترہیب للمنذری ۱۵۲/۲)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا! ''پانچ راتیں ایسی ہیں جس میں دعا رد نہیں کی جاتی۔جمعہ کی رات رجب کی پہلی رات شعبان کی پندرھویں رات اور عیدین کی راتیں۔(مصنف عبدالرزاق ۳۱۷/۴ برقم ۷۹۲۷ ،شعب الایمان بیہقی ۳۴۲/۳ برقم ۳۷۱۳)

امام شافعی لکھتے ہیں!

''بے شک پانچ راتوں میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔جمعہ کی رات، عید الفطر اور عید قربان، رجب کی پہلی رات اور شعبان کی پندرھویں رات''۔(کتاب الام للشافعی ۲۳۱/۱، سنن الکبریٰ بیہقی ۳۱۹/۳)

ابن تیمیہ حنبلی نے لکھا ہے!

''جب کوئی آدمی نصف (شعبان) کی رات تنہا یا خاص جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے جیسا کہ اسلاف میں ایک گروہ کرتا تھا پس وہ اچھا ہے۔(مجموع الفتاوی ۲۵/۲۳)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں!

"لیکن یہ نظریہ کہ یہ رات فضیلت والی ہے۔ یہ اکثر اہل علم کا نظریہ ہے یا اکثر ہمارے علماء اور دیگر کا بھی اور اس پر امام احمد کی نص ہے کیونکہ اس رات کی فضیلت میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ اور آثار سلف بھی اسکی تصدیق کرتے ہیں۔ اور اس رات کے کچھ فضائل مسانید اور سنن میں بھی مروی ہیں۔ (اقتضاء الصراط المستقیم ۲۷۲)

غیر مقلدین (اہل حدیث) کے شیخ الکل فی الکل کا فتویٰ:

سوال: پندرھویں شعبان کو کیا شب قدر کا کوئی ثبوت ہے۔ اس شب کو ثواب جان کر تلاوت یا عبادت کرنا کیسا ہے؟

جواب: اس رات کے متعلق روایتیں ضعیف ہیں۔ اس دن کوئی کار خیر کرنا بدعت نہیں ہے بلکہ بحکم انما الاعمال بالنیات موجب ثواب ہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ ۱/۶۵۲ مطبوعہ سرگودھا)

ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ اس رات میں اگر کوئی مسلمان اپنے خالق و مالک کے سامنے سربسجود ہوتا ہے تو اس پر تنقید نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس رات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اپنی خطاؤں اور لغزشوں کی معافی طلب کرنی چاہیے۔ اور آئندہ کے لیے گناہوں سے تائب ہو کر اس کے تقرب کو حاصل کرنا چاہیے۔ آخر میں گذارش ہے کہ اپنے بچوں کو آتش بازی، پٹاخے وغیرہ سے منع کریں کیونکہ یہ رات آگ سے بچنے کی رات ہے نہ کہ آگ سے کھیلنے کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

قبول اسلام

مورخہ [illegible] بروز جمعۃ المبارک جامع مسجد امام اعظم ابو حنیفہ الہ زار کالونی واہ کینٹ میں اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر دو عیسائی نوجوانوں عمران مسیح اور ساجد مسیح نے خطیب اہل سنت حضرت علامہ مولانا حافظ محمد احسان حسین کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ دونوں کے اسلامی نام محمد عمران اور محمد ساجد رکھے گئے۔ اس موقع پر عوام الناس کا ایک کثیر اجتماع تھا۔ جب حضرت علامہ حافظ محمد احسان حسین مدظلہ العالی نے انہیں کلمہ پڑھایا تو جامع مسجد کی فضا نعرہ تکبیر اللہ اکبر نعرہ رسالت یا رسول اللہ اور نعرہ حیدری کی صداؤں سے گونج اٹھی۔ اللہ کریم دونوں نو مسلموں کو دین اسلام پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

تحریر و تحقیق: افضل شاہد اعوان

اختتام سحر اور اذان فجر

علماء و خطباء کے لیے ایک توجہ طلب مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم O

اسلام میں جن عبادات کے لیے وقت مقرر کیا گیا ہے ان عبادات کو اس وقت پر ہی ادا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ وہ عبادت اکارت چلی جائے گی اور نیکی برباد گناہ لازم کی مصداق بن جائے گی۔ ان عبادات میں روزہ اور نماز سے پہلے اذان بھی شامل ہے۔

روزہ کا وقت صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ اگر اس وقت کی پابندی نہ کی جائے تو کسی صورت روزہ درست نہیں ہوگا اور سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یعنی اگر کوئی مسلمان صبح صادق کے بعد یا غروب آفتاب سے پہلے قصداً کچھ کھا پی لے تو اس کا روزہ باطل ہو جائے گا۔ اسی طرح ہر نماز کے لیے بھی وقت متعین ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا کہ بے شک نماز وقت مقررہ پر مومنوں پر فرض کی گئی ہے۔ ہر نماز سے پہلے اذان جو اس نماز کا وقت شروع ہونے کے بعد دی جاتی ہے سنت مؤکدہ ہے۔ جسے چھوڑنا یقیناً گناہ ہے۔ اذان کے لیے بھی وقت کی پابندی انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ وہ اذان ادا ہی نہ ہوگی اور اگر نماز بھی وقت مقررہ میں ادا نہ کی گئی تو وہ بھی برباد ہو جائے گی۔

اب میں قارئین اور خصوصاً علمائے کرام کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ روزہ بند کرنے کا وقت صبح صادق سے پہلے ہے اور صبح کی اذان کا وقت صبح صادق کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ان دونوں کو کسی صورت باہم ملایا نہیں جا سکتا۔ ہمارے ہاں روزہ بند کرنے کے لیے سائرن بجایا جاتا ہے اور نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے۔ ان دونوں کا وقت

اگر ایک کر دیا جائے یعنی سائرن کے ساتھ ہی اذان پڑھ دی جائے تو لازمی طور پر سائرن غلط وقت پر ہوگا یا صبح کی اذان غلط وقت پر ہوگی۔ سائرن اگر غلط وقت پر یعنی صبح صادق کے بعد ہوا تو جو لوگ اس سائرن پر روزہ بند کریں گے ان کا روزہ نہیں ہوگا۔ اور اگر سائرن ٹھیک وقت پر ہے تو صبح کی جو اذان سائرن کے ساتھ ہوگی وہ غلط ہوگی یعنی وہ ادا ہی نہیں ہوگی۔ اور یوں سنت موکدہ ترک ہو جائے گی۔ وہ بھی رمضان المبارک کے مقدس ماہ میں کہ جس میں ہمیں دوسرے مہینوں کے مقابلے میں زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

ہمارے ہاں یہ معمول بن چکا ہے کہ رمضان المبارک میں روزہ بند کرنے کے لیے جونہی سائرن بجتا ہے فوراً ہی موذین اذانیں شروع کر دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ سپیکر کا بٹن آن کر کے مائیک کے سامنے تیار کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی اس لیے اذان نہیں ہوگی اور اسکا گناہ انکی گردن پر ہوگا۔ چنانچہ سنت موکدہ ترک ہو جاتی ہے اور جو نماز ادا کی جاتی ہے وہ درحقیقت بغیر اذان کے ہوتی ہے۔ حالانکہ اس طرح نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ امام اہل سنت الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں!

''بغیر اذان کے جماعت کرنا مکروہ ہے اور نماز مکروہ ہوگی''۔ (احکام شریعت ص ۱۸۶ مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور)

علامہ عبدالمصطفےٰ اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!

''مسجد میں بلا اذان و اقامت کے جماعت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے''۔ (جنتی زیور ص ۲۰۶ مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور)

مزید فرماتے ہیں کہ!

''وقت ہونے کے بعد اذان پڑھی جائے۔ اگر وقت سے پہلے اذان ہوگئی تو وقت ہونے پر دوبارہ اذان پڑھی جائے''۔ (جنتی زیور ص ۲۰۷ مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور)

مولوی اکرام الحق صاحب دیو بندی ''تنبیہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں!

''اگر اذان وقت سے ایک منٹ بھی پہلے ہوئی تو وہ نہ ہونے کے برابر ہوگی''۔(نماز کی کتاب ص ۱۰۵ مکتبہ اسلامیہ راولپنڈی)

مفتی محمد خلیل خان برکاتی قدس سرہ رقمطراز ہیں!

''وقت ہونے کے بعد اذان کہی جائے۔قبل از وقت کہی گئی یا وقت ہونے سے پہلے شروع ہوئی اور اثنائے اذان میں وقت آ گیا تو (اذان) دوبارہ کہی جائے۔۔۔۔بعض جلد باز نماز فجر کے لیے عموماً وقت سے پہلے ہی اذان شروع کر دیتے ہیں۔خصوصاً ماہ رمضان المبارک میں''۔(سنی بہشتی زیور ص ۱۸۸،مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور)

شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں!

''امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک کسی اذان کو بھی اس کے وقت سے پہلے دینا جائز نہیں ہے۔کیونکہ اذان کا مقصد مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ نماز کا وقت شروع ہو گیا ہے۔اگر نماز کے وقت سے پہلے اذان دے دی جائے تو اوّل تو یہ مقصد فوت ہو جائے گا۔ثانیاً ہو سکتا ہے کہ وقت سے پہلے اذان کی صورت میں کوئی شخص اذان سن کر نماز پڑھ لے۔اور وقت سے پہلے بالاتفاق نماز نہیں ہوتی۔پس اس صورت میں قبل از وقت نماز پڑھنے کی وجہ سے جس کی نماز نہیں ہوگی اس کا ذمہ دار وقت سے پہلے اذان دینے والا ہوگا۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے

''المؤذن مؤتمن'' مؤذن امین ہوتا ہے۔

اس بحث کے آخر میں آپ ایک حدیث نقل فرماتے ہیں!

''امام ابو داؤد حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس وقت تک اذان نہ دو جب تک کہ فجر ظاہر نہ ہو جائے''۔(شرح صحیح مسلم:کتاب الصلوٰۃ جلد اول ص ۱۰۷۳،مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور)

علامہ سید محمود احمد رضوی قدس سرہ رقمطراز ہیں!

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے قبل الفجر اذان دے دی تو حضورﷺ نے انہیں حکم دیا کہ بلند مقام پر چڑھ کر یہ اعلان کریں کہ عبد (بلال) سو گیا تھا اور غافل ہو گیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے یہ اعلان کر دیا اور کہنے لگے کاش بلال کو اس کی ماں نہ جنتی۔ پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے صبح صادق ہونے پر دوبارہ اذان دی۔

نیز طحاوی، مستدرک، بیہقی کے حوالے سے لکھتے ہیں!

''ابن عمر سے روایت ہے کہ حضرت بلال نے فجر سے پہلے اذان دے دی۔ حضورﷺ نے فرمایا بلال تمہیں اس فعل پر کس نے ابھارا۔ عرض کی حضور سو کر اٹھا مگر نیند میں تھا گمان کیا کہ صبح صادق ہو گئی۔ حضورﷺ نے حکم دیا کہ مدینہ میں تین بار اعلان کرو کہ بندہ سویا ہوا تھا (یعنی نیند کی حالت میں تھا) پھر حضورﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے پہلو میں بٹھائے رکھا یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی۔

ان احادیث سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اذان قبل الفجر مشروع نہیں ہے۔ اور اگر غلطی سے دیدی گئی تو وقت ہونے پر دوبارہ دی جانی چاہیے''۔ (فیض الباری شرح بخاری، باب الاذان قبل الفجر۔ جلد دوم ص ۲۲۵)

ہمارے ہاں سائرن کے ساتھ اذان دینے کی غلطی اتنی عام ہو چکی ہے کہ سوائے چند ایک کے تمام مساجد میں اس کا ارتکاب ہوتا ہے۔ نہ صرف چھوٹی مساجد بلکہ بڑی بڑی جامع مساجد اور دینی مدارس جہاں جید علماء وخطباء موجود ہیں، وہاں بھی یہ غلطی دیکھنے سننے میں آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی اس صف میں شامل نظر آتے ہیں۔ نہ صرف سنی بریلوی مسلک کی مساجد بلکہ دیوبندی مسلک کی مساجد میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں۔

اگر تفاسیر، احادیث اور کتب احناف کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ روزہ بند کرنے کا وقت صبح صادق سے پہلے ہے اور اذان فجر کا وقت صبح صادق کے

بعد ہے۔ چنانچہ دیوبندی مکتبہ فکر کے عالم مفتی محمد شفیع ''روزے کے معاملے میں احتیاط کا حکم'' کے عنوان کے تحت ''تلك حدود الله فلا تقربوها '' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ موخر کرنا بہتر ہے۔ اس میں بے پرواہی اور سہل نگاری اس ارشاد خداوندی کے خلاف ہے''۔ (معارف القرآن جلد اول ص ۴۵۶)

سورۃ البقرۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے!

''وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ''۔

ترجمہ: اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے ظاہر ہو جائے سفیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے پو پھٹ کر۔ (کنزالایمان)

اس آیت مبارکہ میں رات کو سیاہ ڈورے اور صبح صادق کو سفید ڈورے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

امیر دعوت اسلامی مولانا محمد الیاس قادری اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں!

''اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ کا اذان فجر سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی فجر کی اذان کے دوران کھانے پینے کا کوئی جواز ہی نہیں۔ اذان ہو یا نہ ہو۔ آپ تک آواز پہنچے یا نہ پہنچے۔ صبح صادق ہوتے ہی آپ کو کھانا پینا بالکل ہی بند کرنا ہوگا''۔ (فیضان رمضان: ص ۱۲۶، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ کراچی)

مولانا محمد حنیف اختر لکھتے ہیں!

''اکثر لوگ فجر کی اذان ہونے تک سحری کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے روزے کو ضائع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ روزہ بند کرنے کا تعلق اذان فجر سے نہیں بلکہ صادق سے ہے۔ اور صبح صادق سے پہلے کھانا پینا بند کرنا ضروری ہے''۔ (مسائل رمضان المبارک ص ۹ مطبوعہ مرکزی انجمن غلامان مصطفےٰ خانیوال)

امام بخاری علیہ الرحمہ نے ''صحیح البخاری'' میں کتاب الصوم کے اندر باقاعدہ ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے ''باب قدر کم بین السحور وصلاۃ الفجر ''یعنی سحری ختم ہونے اور نماز فجر میں کتنا فاصلہ ہونا چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم نے نبی علیہ السلام کے ساتھ سحری کھائی۔ پھر آپ صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے پوچھا سحری اور صبح کی اذان میں کتنا فاصلہ ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ پچاس آیتیں پڑھنے کی مقدار''۔ (صحیح البخاری کتاب الصوم ص ۸۲۹، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور)

اس حدیث کو مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور سنن دارمی نے بھی کتاب الصوم میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ سید محمود احمد رضوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!

''اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فجر کا وقت جب شروع ہوتا ہے جب کہ روزہ دار کی سحری کھانے کا وقت ختم ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فجر کا اول وقت طلوع صبح صادق ہے اور حضور علیہ السلام سحری سے فارغ ہو کر نماز کے لیے اتنی دیر بعد متوجہ ہوتے جتنی دیر میں پچاس یا ساٹھ آیتیں پڑھی جاسکیں''۔ (فیوض الباری، باب وقت الفجر، جلد دوم ص ۳۶۰، مطبوعہ لاہور)

اب اگر قرأت کے قواعد کے مطابق مخارج کی صحت کا لحاظ کرتے ہوئے پچاس یا ساٹھ آیات کی تلاوت کی جائے تو ظاہر ہے کہ تقریباً دس منٹ تو خرچ ہوں گے۔ لہذا ہمیں بھی اختتام سحر اور فجر کی اذان کے درمیان وقفہ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ اپنی مشہور زمانہ کتاب ''بہار شریعت'' میں لکھتے ہیں!

سحری چھوڑنے کا جو وقت بیان کیا گیا اس کے آٹھ دس منٹ بعد اذان کہی جائے تا کہ سحری اور اذان دونوں طرف احتیاط رہے۔ (بہار شریعت: حصہ سوم ص ۱۳۶، موتال بلی کیشنز راولپنڈی)

دیوبندی مکتبہ فکر کے عالم مولانا محمد منظور نعمانی بخاری شریف کی مندرجہ بالا حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں!

''صحت مخارج اور قواعد قرأت کے لحاظ کے ساتھ پچاس آیات کی تلاوت میں پانچ منٹ سے کم وقت صرف ہوتا ہے۔اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سحری اور اذان کے درمیان صرف چار پانچ منٹ کا فصل تھا''۔(معارف الحدیث کتاب الصوم جلد چہارم مطبوعہ کراچی)

اگرچہ نعمانی صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ نبی علیہ السلام کے دور میں سحری اور اذان کے درمیان وقفہ ہوتا تھا۔لیکن انہوں نے یہ جو لکھا ہے کہ چار پانچ منٹ کا وقفہ ہوتا تھا اس سے ہمیں اختلاف ہے۔اس لیے کہ صحت مخارج اور قواعد قرأت کے مطابق اگر پچاس آیات کی تلاوت کی جائے تو تقریباً دس منٹ کا وقت درکار ہوتا ہے۔چنانچہ اہل حدیث مکتبہ فکر کے عالم حافظ صلاح الدین یوسف بخاری شریف کی اسی حدیث کے فوائد میں لکھتے ہیں!

''اس سے معلوم ہوا کہ سحری بالکل آخری وقت میں کھائی جائے۔یہی سنت طریقہ ہے۔تاہم صبح صادق سے پہلے پہلے کھالی جائے اور یہ وقفہ بقدر پچاس آیات اندازاً دس منٹ ہو''۔(ریاض الصالحین: کتاب الفضائل فوائد نمبر ۱۲۳۳،ص ۲۲۴،مطبوعہ دارالسلام لاہور)

امیر دعوت اسلامی مولانا محمد الیاس عطار قادری دامت برکاتہم فرماتے ہیں!

''سحری میں اتنی تاخیر بھی نہ کردیں کہ صبح صادق کا شک ہونے لگے۔جیسا کہ بعض لوگ صبح صادق کے بعد فجر کی اذانیں ہو رہی ہوتی ہیں اور وہ کھاتے پیتے رہتے ہیں۔اگر کھاتے نہیں تو پانی پی کر روزہ بند ضرور کرتے ہیں۔آہ بے چارے اس طرح روزہ بند تو کیا کریں گے روزے کو بالکل ہی کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔اس طرح روزہ ہوتا ہی نہیں اور سارا دن بھوک پیاس کے سوا کچھ ہاتھ آتا ہی نہیں۔اور روزہ بند کرنے کا تعلق اذان فجر سے نہیں بلکہ صبح صادق سے پہلے پہلے کھانا پینا بند کرنا ضروری ہے''۔(فیضان سنت ص ۱۰۷۲)

حضرت علامہ مولانا شہزاد قادری ترابی لکھتے ہیں!

''ہمارے یہاں بیماری یہ نکل آئی کہ ریڈیو،ٹی وی ہونے کے باوجود ہم جب تک اذان نہ سن لیں یا جب تک اذان ختم نہ ہو جائے اس وقت تک کھانے کی کاروائی جاری رکھتے

ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ سحری کا جو وقت ختم ہونے کا ہے اس سے پانچ منٹ پہلے روزہ بند کرلیں تاکہ اگر گھڑی آگے پیچھے ہو تو روزہ ضائع نہ ہو جائے۔ اذان کا انتظار نہ کریں کیونکہ اذان روزہ بند کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ نماز کے لیے ہوتی ہے۔ اور اذان کا وقت سحری کا وقت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ غروب آفتاب کا وقت معین ہے اس میں بھی دو چار منٹ تاخیر میں کوئی حرج نہیں۔ (شریعت محمدی کے ہزار مسائل ص ۱۵۳ مطبوعہ ادبی پبلشرز دربار مارکیٹ لاہور)

قاری عتیق احمد خان قاسمی دیوبندی لکھتے ہیں!

''سحری بھی تا حد مقدور اخیری وقت میں افضل ہے۔ لیکن اتنی تاخیر جائز نہیں کہ طلوع سحر کا شبہ ہونے لگے۔ دائمی مستند جنتریوں کے مطابق اپنی گھڑی کو درست رکھیں اور روزہ احتیاط سحری سے تین منٹ پہلے ختم کریں''۔ (رمضان المبارک ص ۳۷ مطبوعہ دہلی انڈیا)

معروف دیوبندی عالم دین مولانا محمد یوسف لدھیانوی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں!

''اگر صبح صادق ہو جانے کے بعد کھایا، پیا تو روزہ نہ ہوگا۔ خواہ اذان ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اور اذانیں عموماً صبح صادق کے بعد ہوتی ہیں۔ اس لیے اذان کے وقت کھانے پینے والوں کا روزہ نہیں ہوگا۔ عموماً مسجدوں میں اوقات کے نقشے لگے ہوتے ہیں۔ ابتدائے فجر کا وقت دیکھ کر اس سے چار پانچ منٹ پہلے سحری کھانا بند کر دیا جائے''۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل، جلد سوم ص ۲۴۲)

مولوی اکرام الحق صاحب نے ''روزہ کا بیان'' کے عنوان سے ایک باب میں تنبیہ کرتے ہوئے لکھا ہے!

''بندش سحری کے لیے اگر سائرن سے خبردار کیا جاتا ہو اور اس کے ساتھ ہی اذانیں شروع کر دی جائیں تو غلط ہوگا۔ اس طرح یا تو روزہ ضائع ہوتا ہے یا اذان باطل ہو جاتی ہے۔ چونکہ سائرن صبح صادق سے پہلے اور اذان کا صبح صادق کے بعد ہونا ضروری ہے اور دونوں کا ایک وقت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ سائرن تو اپنے وقت پر ہی ہو لیکن اذان سے

سحری بند کرنے کا کام نہ لیا جائے اور وہ (مناسب وقفہ سے) صبح صادق کے چند منٹ بعد کی جائے"۔ (نماز کی کتاب (مکمل) ص ۱۷۱ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ راولپنڈی)

یہی مولانا صاحب ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں!

"رمضان شریف میں اذان فجر صبح صادق سے پہلے نہ ہونے پائے اور جمعہ کی اذان زوال کے بعد ہونا ضروری ہے۔ایسے اوقات میں کم از کم تین چار منٹ کی احتیاط ضرور کریں۔ (ایضاً ص ۱۰۲)

روزے سے متعلق ایک خطرناک غلطی:

مذکورہ بالا عنوان کے تحت دیوبندی مکتبہ فکر کے ادارہ غفران ٹرسٹ گلی نمبر ۱۷ چاہ سلطان راولپنڈی کے دارالافتاء کی طرف سے ایک چھوٹا سا اشتہار شائع کیا گیا جس کی تحریر مندرجہ ذیل ہے۔

"آج کے دور میں دین سے دوری اور جہالت کی وجہ سے اکثر روزہ رکھنے والے حضرات فجر کی اذان شروع ہونے تک سحری کھانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور بعض لوگ تو اذان ختم ہونے تک جبکہ بعض لوگ آخری اذان اور بعض لوگ محلہ کی اذان ہونے تک سحری کھانے میں مبتلا پائے گئے ہیں۔ حالانکہ سحری ختم کرنے کا تعلق اذان سے نہیں بلکہ صبح صادق ہو جانے سے ہے اور اذان تو نماز فجر کے لیے دی جاتی ہے۔ جس کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے۔ اذان درحقیقت نماز کی سنت ہے نہ کہ روزے کی۔ خوب سمجھ لیجئے کہ! اگر اذان صبح صادق ہو جانے کے بعد ہوئی اور اس پر کچھ بھی کھایا پیا گیا تو روزہ نہیں ہوگا اور اگر اذان ہی صبح صادق ہونے سے پہلے ہوگئی تو پھر یہ اذان فجر کی جماعت کے لیے صحیح نہ ہوگی، اس لیے اذان کو سحری ختم ہونے کا معیار بنانا یا اذان صبح صادق سے پہلے پڑھنا سخت نقصان کی چیز ہے۔ سحری ختم کرنے کے لیے (اور اسی طرح افطار کے لیے) مستند کیلنڈر اور جنتریوں میں درج شدہ وقت کو اپنی صحیح گھڑی کے ساتھ معیار بنائیے اور یا مسجدوں میں یہ اہتمام کیا جائے کہ سحری ختم ہونے سے

کچھ وقت پہلے سحری کے ختم ہونے کی اطلاع دی جائے۔ مثلاً زبانی اعلان ہو یا کسی جگہ سائرن بجایا جائے پھر صبح صادق ہو جانے کے بعد اذان پڑھی جائے۔ اس مسئلہ کو خود سمجھئے اور اپنے گھر والوں کو بھی سمجھایئے"۔

"وفی الهندیه تقدیم الاذان علی الوقت غیر الصبح لایجوز اتفاقاً وکذا فی الصبح عند ابی حنیفة ومحمد وان قدم یعاد فی الوقت هکذا فی شرح مجمع البحرین لابن الملک وعلیه الفتویٰ هکذا فی التتار خانیه الخ" (عالمگیری ج ۱ ص ۵۳ وکذا فی البحر الرائق ج ۱ ص ۲۶۲،۲۶۳ وکذا فی اعلاء السنن ج ۲ ص ۱۱۳،۱۱۴،۱۱۵)

تفصیل اور دلائل کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۱۰۵، امداد الاحکام ج ۲ ص ۱۰۹،

احسن الفتاویٰ ج ۲ ص ۲۹۰، ۲۹۱، ج ۳ ص ۴۴۱، ۴۵۳

خیر الفتاویٰ ج ۲ ص ۰۷ آپ کے مسائل اور ان کا حل ج ۳ ص ۲۶۸"۔

اوقات نماز اور سحر و افطار کے نقشوں کے سلسلہ میں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ علم توقیت کی بنا پر مرتب کیے جاتے ہیں۔ تو ایک شہر یا علاقے کے لیے ترتیب دیے گئے ایک سے زیادہ نقشوں کا اگر موازنہ کیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ ان کے اوقات میں تھوڑا بہت فرق پایا جاتا ہے جو کہ ایک منٹ سے لے کر پانچ منٹ تک ہو سکتا ہے بلکہ موجود ہے۔ چنانچہ دہلی کے مشہور عالم دین مفتی اعظم حضرت علامہ مفتی شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی علیہ الرحمہ نے اپنے نقشہ اوقات نماز میں اس کا اعتراف خود فرمایا ہے اور لکھا ہے!

"اس نقشہ کے اوقات میں بھی احتیاط سے کام لیں۔ کہ اول تو سیکنڈ چھوڑ دیے گئے ہیں اس لیے سیکنڈوں کا فرق تو ضروری ہے۔ پھر بعض دشواریوں کی وجہ سے تو اعد فن پر بھی کما حقہ عمل نہیں کیا گیا اس لیے بعض مقامات پر منٹ دو منٹ کا فرق بھی رہ گیا ہو تو تعجب نہیں"۔

ہمارے ہاں مفتی اعظم ہند مولانا شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کا نقشہ اوقات نماز عموماً استعمال ہوتا ہے۔ جو کہ مستند بھی ہے اور بریلوی دیوبندی مکاتب فکر کے ہاں یکساں طور پر مقبول بھی۔ اس نقشہ میں انتباہ کے خصوصی عنوان کے تحت لکھا ہے!

"نماز کے حق میں کم از کم پانچ منٹ اور روزہ کے حق میں بھی پانچ منٹ کی احتیاط لازمی ہے۔ یعنی مثلاً اس نقشہ میں کسی روز صبح صادق کا وقت جو لکھا ہوا ہے اس سے پانچ منٹ پیشتر سحری تناول کرنا موقوف کر دیں اور اس وقت سے کم از کم پانچ منٹ بعد اذان صبح دیں"۔

لہذا مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی اس ہدایت پر اگر عمل کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اختتام سحر اور فجر کی اذان میں دس منٹ کا وقفہ ہونا چاہیے۔

سحر و افطار کے لیے جو نقشہ جات رمضان میں ترتیب دیے جاتے ہیں وہ دائمی نقشہ اوقات نماز کی مدد سے ہی بنائے جاتے ہیں۔ لہذا محتاط علمائے کرام احتیاطاً سحری و افطاری کے اوقات میں دونوں طرف دو چار منٹ کی گنجائش رکھتے ہیں۔ یعنی سحری کا وقت اصل وقت سے دو تین منٹ قبل اور افطاری کا وقت دو تین منٹ بعد دیتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے شہر واہ کینٹ میں سحر و افطار کا ٹائم ٹیبل مرکزی جامع مسجد کے خطیب حضرت علامہ قاضی عبدالوحید سعیدی صاحب ترتیب دیتے ہیں۔ اسی کے مطابق پورے واہ کینٹ میں سائرن بجائے جاتے ہیں۔ اگر قاضی صاحب کے اس ٹائم ٹیبل کا مفتی مظہر اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کے نقشہ اوقات نماز سے موازنہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ قاضی صاحب احتیاطاً سحری کا وقت اصل وقت سے دو منٹ قبل اور افطاری کا وقت تقریباً چار منٹ بعد رکھتے ہیں۔ تو گویا قاضی صاحب کے اس ٹائم ٹیبل کے مطابق رمضان میں جب اختتام سحر کا سائرن بجتا ہے تو اس وقت ابھی صبح صادق ہونے میں یقیناً دو منٹ باقی ہوتے ہیں۔ اب جو لوگ سائرن کے ساتھ ہی صبح کی اذان شروع کر دیتے ہیں وہ کسی طور بھی درست نہیں ہو سکتی۔ تو پھر مجھے بتایا جائے کہ اس کا گناہ کس کی گردن پر ہوگا کہ رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں گویا صبح کی

نماز تقریباً تمام مساجد میں اذان فجر کے بغیر ادا کی جاتی ہے۔ کیونکہ وقت سے پہلے دی گئی اذان، اذان نہیں ہوتی۔ مفتی مظہر اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کے نقشہ پر تنبیہ کے عنوان سے واضح طور پر یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر وقت سے پیشتر اذان دیدی گئی تو وقت کے اندر اذان لوٹانا ضروری ہوگا۔

دعوت اسلامی کی طرف سے جو مستقل نقشہ اوقات نماز اور سحر و افطار جاری کیا گیا ہے وہ سب کے لیے قابل تقلید اور انتہائی مفید ہے۔ اس میں باقاعدہ ختم سحری اور آذان فجر کے لیے الگ الگ کالم بنائے گئے ہیں اور ہر روز ان میں چار منٹ کا فرق رکھا گیا ہے۔ بدقسمتی سے عام طور پر لوگوں کا یہی معمول دیکھا گیا ہے کہ وہ اذان پر ہی سحری و افطاری کا دارومدار رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض تو اذان فجر کے دوران ہی روزہ بند کرتے ہیں۔ اس عام غلطی کو دور کرنے کے لیے کیا ہی اچھا ہوتا کہ رمضان المبارک میں روزانہ صبح صادق سے تھوڑی دیر پہلے ہی ہر مسجد میں اس طرح اعلان کر دیا جائے کہ تمام روزہ رکھنے والے اسلامی بھائی، بہنیں کھانا پینا بند کر دیں اور یہ بھی سمجھانا چاہیے کہ اذان فجر لازمی طور پر صبح صادق کے بعد ہی ہوتی ہے اور وہ روزہ بند کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف فجر کے لیے دی جاتی ہے"۔ (فیضان سنت: مولانا محمد الیاس قادری، ص ۷۵۰، مکتبۃ المدینہ کراچی)

الحمد للہ میرے گاؤں کی تمام مساجد میں اختتام سحر کے لیے اعلان ہوتا ہے اور دس منٹ بعد اذان فجر ہوتی ہے۔ یہ مولانا محمد اشرف نقشبندی علیہ الرحمہ کی محنت اور تربیت کا نتیجہ ہے۔

آخر میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ افطاری مغرب کی اذان کے ساتھ ہو سکتی ہے لیکن سحری کا اختتام اذان فجر سے پہلے ہونا چاہیے اور اذان کچھ وقفہ کے بعد ہونی چاہیے۔ اس لیے علماء، خطباء و ائمہ مساجد اور مؤذن حضرات کو چاہیے کہ اس مسئلہ پر توجہ دیں۔ اور روزوں اور نمازوں کو خراب ہونے سے بچائیں ورنہ بروز محشر اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

تحریر: محمد نور المصطفیٰ رضوی

مسائل روزہ

روزہ توڑنے والے کام: (۱) کھانے، پینے، یا جماع کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جب کہ روزہ دار ہونا یاد ہو ورنہ نہیں۔ (۲) حقہ سگریٹ، بیڑی، سگار وغیرہ پینے سے پان تمباکو وغیرہ کھانے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے (۳) شکر چینی، گڑ وغیرہ ایسی چیزیں جو منہ میں رکھنے سے گھل جاتی ہیں۔ منہ میں رکھیں اور تھوک نگل لیا تو روزہ ٹوٹ گیا۔ (۴) دانتوں میں کوئی چیز چنے برابر یا اس سے زیادہ تھی اُسے کھا گیا یا کم ہی تھی مگر منہ سے نکال کر پھر کھائی تو روزہ جاتا رہا۔ (۵) دانتوں سے خون نکل کر حلق سے نیچے اترا اور مزا محسوس ہوا تو روزہ گیا۔ ایک دو بوند آنسو منہ میں چلا گیا تو حرج نہیں اگر زیادہ چلا گیا اور مزا حلق میں محسوس ہوا تو روزہ نہ رہا۔ (۶) نتھنوں میں دوا چڑھائی یا کان میں تیل ڈالا یا خود چلا گیا تو روزہ ٹوٹ گیا مگر پانی کان میں چلا گیا یا ڈالا تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (۷) منہ میں رنگین ڈورا رکھا جس سے تھوک رنگین ہو گیا اور تھوک نگل لیا تو روزہ ٹوٹ گیا۔ (۸) قصداً منہ بھر قے کی اور روزہ دار ہونا یاد تھا تو روزہ ٹوٹ گیا۔ اگر قے میں صرف بلغم ہو تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

جن چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا: (۱) بھول کر کھایا پیا یا جماع کیا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (۲) مکھی یا دھواں یا گرد حلق میں جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ لیکن اگر قصداً مکھی نگلی یا خود دھواں پہنچایا تو روزہ ٹوٹ گیا۔ تیل یا سرمہ لگایا تو روزہ نہ ٹوٹا۔ (۳) دانت سے خون نکل کر حلق تک پہنچا مگر نیچے نہ اُترا یا بھولے سے کھانا کھا رہا تھا یاد آتے ہی فوراً نوالہ تھوک دیا تو روزہ نہ گیا یونہی سحری کھاتے کھاتے صبح صادق ہو گئی اسی وقت نوالہ اُگل دیا تو روزہ نہ ٹوٹا۔ (۴) تل یا تل کے برابر کوئی چیز چبائی یا وہ تھوک کے ساتھ حلق میں اتر گئی تو روزہ نہ گیا۔ مگر مزا حلق میں محسوس ہوا تو جاتا رہا۔

روزے میں جو کام مکروہ ہیں: (۱) جھوٹ، چغلی، غیبت، گالی دینا، بیہودہ بکنا، کسی کو ناجائز تکلیف دینا، ویسے بھی حرام مگر روزے میں زیادہ حرام اور اُن کی وجہ سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔

۲)روزہ دار کو بلا عذر کسی چیز کا چکھنا یا چبانا مکروہ ہے۔(۳)منہ میں تھوک اکٹھا کر کے نگل جانا اچھا نہیں اور روزے میں تو یہ مکروہ ہے۔(۴)گلاب یا مشک وغیرہ سونگھنا داڑھی مونچھ میں تیل لگانا اور سرمہ لگانا مکروہ نہیں۔(۵)روزہ دار کے لیے کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے

جن صورتوں میں قضا لازم ہے:(۱)گمان یہ تھا کہ صبح صادق شروع نہیں ہوئی اس لیے کھایا پیا اور بعد کو یہ خیال غلط ثابت ہوا یا یہ گمان کر کے کہ سورج ڈوب چکا ہے افطار کر لیا حالانکہ سورج ڈوبا نہیں تھا تو روزہ ٹوٹ گیا مگر صرف قضا رکھے۔(۲)بھول کر کھایا پیا اور گمان کیا کہ روزہ ٹوٹ گیا اور اب قصداً کھایا پیا تو صرف قضا ہے۔(۳)کان میں تیل ٹپکایا یا پیٹ یا دماغ کی جھلی تک زخم تھا اس میں دوا ڈالی جو پیٹ یا دماغ تک پہنچ گئی یا ناک سے دوا چڑھائی یا پتھر، کنکری، مٹی، روئی، کاغذ، گھاس وغیرہ ایسی چیز کھائی جس سے لوگ گھن کرتے ہیں تو صرف قضا لازم ہے۔(۴)صبح کو نیت نہیں تھی اور زوال سے پہلے کر لی مگر پھر کچھ کھا لیا تو صرف قضا کرے (۵)حلق میں بارش کی بوند یا اولا چلا گیا یا بہت سے آنسو یا پسینہ نگل لیا تو صرف قضا ضروری ہے۔

جن حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے:(۱)سفر شرعی، حمل، بیماری اور بڑھاپا، ہلاک ہونے کا ڈر، یہ سب روزہ نہ رکھنے کے عذر ہیں۔ان عذروں کی وجہ سے روزہ نہ رکھنا گناہ نہیں مگر بعد میں قضا ضروری ہے۔(۲)بھوک یا پیاس ایسی ہو کہ ہلاک یا پاگل ہو جانے کا ڈر ہو۔(۳)سانپ نے کاٹا یا ویسے ہی جان کا خطرہ ہو تو روزہ توڑ دیں۔شیخ فانی یعنی وہ بوڑھا جو عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اب روز بروز کمزور ہی ہوگا تو اُسے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ہاں روزے کے بدلے فدیہ یعنی دونوں وقت ایک مسکین کو پیٹ بھر کھانا کھلانا اُس پر واجب ہے۔اگر فدیہ ادا کرنے کے بعد روزہ رکھنے کی طاقت دوبارہ آ گئی تو روزہ رکھنا واجب ہے۔اور یہ فدیہ صدقہ نفل ہو گیا۔نوٹ:رمضان کا روزہ قصداً توڑنے سے کفارہ لازم ہو جاتا ہے یعنی ایک غلام آزاد کرنا یا لگاتار ساٹھ روزے رکھنا یا ساٹھ مسکینوں کو پیٹ بھر دونوں وقت کھانا کھلانا۔

کرنل (ر) الطاف محمود ہاشمی☆

قبر سے حصول فیض (آخری قسط)

یہ بات متفق علیہ ہے کہ زندگی کے اعمال کے نتیجہ کا حصول برزخی زندگی میں قیامت تک طاری اور جاری وساری رہے گا۔ان معنوں میں حصن حصین میں یہ حدیث وارد ہے: کَمَا تَعِیْشُوْنَ تَمُوْتُوْنَ وَکَمَا تَمُوْتُوْنَ تُحْشَرُوْنَ [ترجمہ: جس عمل پر زندگی گزارو گے اسی پر موت آئے گی اور جس عمل پر مرو گے (قیامت کے دن) اسی پر اٹھائے جاؤ گے۔] یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ نور عطا فرما دیا اور ان کا خاتمہ بخیر ہو گیا، یہ نور قیامت تک ان کے جسم و روح پر وارد ہوتا رہے گا۔جس طرح زندہ شخص سے یہ انوار دوسرے کو منتقل ہوتے ہیں اسی طرح فوت شدہ شخص سے بھی ان کا ورود جاری رہتا ہے۔فرق یہ ہے کہ زندہ شخص خود اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق یہ انوار دوسروں کو منتقل کرتے ہیں جبکہ فوت شدہ شخص سے یہ انوار اپنی ہمت سے لینا پڑتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت خواجہ محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ نے ''ذکرِ خیر'' میں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اس سے متعلق بیان کیا ہے!

''فرمایا کہ فوت شدہ اولیاء اللہ میں نفس نہیں ہوتا۔اس واسطے فیض لینے والے کو اپنی طاقت سے کھینچ کر فیض لینا پڑتا ہے۔اور صاحب ارشاد کی صحبت میں بہت فائدہ ہے کیونکہ اس میں نفس ہے اور اس نفس کی عجیب خاصیت ہے۔جب یہ برائی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتا ویسے ہی جب یہ قابو میں آ جائے اور مطمئن ہو جائے تو کام بھی بڑے اچھے کرتا ہے......فوت شدہ اولیاء اللہ کی قبر سے ابتدا میں فیض لینا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔چاہیے کہ زندہ صاحب ارشاد سے بیعت ہو کر پہلے فیض لینے کی اٹکل (طریقہ) سیکھے پھر اگر قبور سے فیض لے تو ترقی ہو سکتی ہے ورنہ دیکھیے لو قبور پر جو مجاور بیٹھے رہتے ہیں کسی کو فیض کی خبر ہی نہیں اور سب سے زیادہ ان کو ہی فیض ہونا چاہیے تھا

(☆ 0300-5570547، فلیٹ نمبر D-48، عسکری-7، اڈیالہ روڈ راولپنڈی

کیونکہ ہر وقت یہ ان کے پاس رہتے ہیں۔ اور زندہ اولیاء اللہ کے پاس اگر یونہی بیٹھ جاؤ چاہے متوجہ بھی نہ ہو، نہ فیض کھینچو، تا ہم بلا ارادہ فیض پڑتا رہتا ہے''۔

اس تحریر کے ہر قاری سے میرا سوال ہے کہ وہ آج تک جن بزرگوں کی خدمت میں جاتے رہے ہیں، کیا ان کی خدمت سے ''سفر در وطن'' میسر آیا ہے؟ سفر در وطن، چلوں اور وظیفوں (اگر انہوں نے کرائے ہوں) کے نتیجہ میں انوار کا ورود اور شرح صدر محسوس کیا ہے؟ اگر جواب ''ہاں'' میں ہے تو بہت خوب، ان صاحب کا پلہ کبھی نہ چھوڑیے۔ اور اگر جواب نفی میں ہے تو اپنی عقیدت کے قبلے کا رخ درست کرنے کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے تاکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کے سامنے شرمندگی سے بچ سکیں۔ (جواب نفی میں ہونے کی صورت میں میری تحریر ''بیعت اور تجدید بیعت'' کا مطالعہ فرمائیں۔) آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم برس ہا برس ایسے لوگوں کی خدمت میں حاضر ہونے، نذرانے پیش کرنے، ان کے بتائے ہوئے عملیات و معمولات پر عمل کرنے کے باوجود کیوں قرآنی انوار اور شرح صدر سے محروم رہتے ہیں؟ چلیں یہ نہیں حاصل ہو سکا تو کم از کم اس کا شوق ہی پیدا ہو جاتا اور ایسے شخص کی تلاش کا بھوت ہی سوار ہو جاتا جسے اللہ تعالیٰ نے ان انعامات سے نوازا ہو۔ غالباً اس کی وجہ ایسے نام نہاد بزرگوں کے کردار میں سوائے شہوت، غصہ، لالچ، حسد اور تکبر اور کچھ ہے ہی نہیں۔ گدیوں کو تربیت کی بجائے کاروباری بنا دیا گیا ہے۔ آیئے نامکمل اور ناقص لوگوں سے اخذِ فیض یا حصولِ فیض کے نتائج پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ذکرِ خیر میں خواجہ محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے!

''(حضرت توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ نے) میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا سکرت کی حالت میں ایک روز ہماری سیر ہوئی۔ ہم چھلوں (ہندوؤں کے مردے جلانے کی جگہ) میں گئے تو وہاں کلمہ شریف کا فیضان محسوس ہوا۔ ہم نے جو خیال کیا تو ایک شخص کو وہاں کلمہ شریف پڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ شخص وہاں کلمہ شریف بھی پڑھتا تھا مگر اس کے پیٹ میں آگ لگی ہوئی تھی

اور دھواں نکلتا تھا۔ ہم نے پوچھا اس کی کیا وجہ کہ تیرا اور تمام بدن تو اچھا ہے اور پیٹ سے دھواں نکلتا ہے؟ تو کہنے لگا کہ مجھے اسلام پر یقین تھا اور احکام اسلام کا متبع تھا لیکن میں جو کھانے کی حرص سے کافروں کے دین میں رہا اس واسطے اسی جگہ پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے باقی سب بدن آگ سے بچا ہوا ہے"۔

قدرت اللہ شہاب نے "شہاب نامہ" ☆میں جھنگ کی کسی بہت بڑی گدی کے سجادہ نشین "غلام مرشد خان" کا واقعہ لکھا ہے۔ اس واقعہ کا ایک ایک لفظ اور ایک فقرہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے لیکن گنجائش نہ ہونے کی بنا پر اس کا اختصار تحریر کرتا ہوں۔ غلام مرشد خان کے ہاں رات کو عرس "مبارک" کی دو محفلیں ہوتیں۔ پہلی محفل مریدین اور عام زائرین کے لیے جس میں قوالی، عارفانہ کلام اور "حال پڑنے" کا خاص اہتمام کیا جاتا۔ دوسری محفل نصف شب کے بعد ضلعی اور دوسرے افسرانِ بالا کے لیے حضرت کی حویلی میں منعقد ہوتی جس میں طوائفوں کے مجرے کا خاص انتظام و انصرام ہوتا۔ یہ محفلِ رقص و سرود صبح تک جاری رہتی۔ حضرت غلام مرشد خان صاحب کو جو بچی پسند آتی اس کے گھر اپنی پگڑی بھجوا دیتے۔ جس گھر میں پگڑی پہنچتی اکثر گھروں والے اسے اپنے لیے باعثِ برکت سمجھتے۔ قدرت اللہ شہاب کو جھنگ کا ڈپٹی کمشنر ہونے کے ناطے ایک خط موصول ہوا "پیر صاحب کی پگڑی ہمارے گھر پہنچ گئی ہے، خدارا میری عزت بچائیں"۔ رات کو ان کے گھر پر چھاپا مارا گیا۔ سکینہ کی عزت تو بچ گئی لیکن پیر صاحب پکڑے نہ جا سکے (آخر "بزرگوں کی اولاد" تھے کچھ نہ کچھ "کرامت" تو رکھتے ہوں گے کہ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ (الطاف) ان حضرت کا مزار یقیناً جھنگ میں کسی جگہ کسی نام سے موجود ہوگا اور حصولِ طریقت کے شائقین ان کے مزار پر ظلمات سے "فیض" اور "انوار" کی خیرات پانے جاتے ہوں گے اور اس کا بھرپور تذکرہ بھی کرتے ہوں گے۔ ان حضرت کا وزٹنگ کارڈ جو شہاب صاحب نے نقل کیا ہے یوں ہے:

حضرت قبلہ و کعبہ فخر سالکاں رہنمائے عاشقاں آفتاب طریقت ماہتاب معرفت

☆ یاد رہے کہ غلام مرشد خان رافضی مذہب ہے اور مذکورہ گدی اہل سنت کی نہیں ہے۔ (مدیر اعلیٰ)

جناب مخدوم زادہ غلام مرشد خاں صاحب پیر، لینڈ لارڈ اینڈ لیڈر

ایک سجادہ نشین جو اپنی جوانی سے لے کر اب بڑھاپے تک پرلے درجے کا زانی اور شرابی مشہور رہا ہے، ایک گدی کا سجادہ نشین ہونے کے ناطے اس کے پاس نیک و بد ہر قسم کے لوگوں کا آنا جانا ہے۔ کل کلاں اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر خوبصورت مزار اور قبہ بنایا جائے گا اور ہم جیسے کتنے ناقص اس کی قبر سے ''فیض'' حاصل کرنے جایا کریں گے اور قبر سے اٹھ کر لوگوں کو صاحب مزار کے مقام و مرتبہ کے علاوہ خود کو حاصل ہونے والے فیض اور نور کا بھرپور ذکر کیا کریں گے۔

میرا سوال ہے کہ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو کسی زندہ یا فوت شدہ شخص کو بزرگ گردان کر حصولِ فیض کے لیے جاتے ہوئے ان میں سے کسی بات کی بھی تحقیق کرتے ہوں؟ اس بات کا احتمال تو نہیں ہے کہ ہم جس شخص سے فیض حاصل کرنے جا رہے ہوں وہ قرآن پاک کی نظر میں مستقل جہنمی ہو اور حبیب خدا ﷺ کے فرامین کے مطابق منافق ہو؟ ایسے حضرات سے جوق در جوق فیض لینے کے لیے آنے والے لوگوں کو خیال کرنا چاہیے کہ کیا ان سے سفر در وطن، ورود انوار اور شرح صدر کی کوئی موہوم سی توقع بھی ہوگی؟ ایسا شخص بزرگ، پیر یا سجادہ نشین چھوڑ الٹا لٹک کے نماز پڑھتا ہو، سارا دن لنگر کھلاتا ہو، ہوا میں اڑتا ہو کیا اس کی یہ کراماتیں مدنظر رکھی جائیں گی یا خدا اور اللہ کے حبیب ﷺ کے ارشادات؟ کیا ہم میں سے ہر مسلمان کا یہ فرض نہیں بنتا کہ حصولِ فیض سے قبل ان امور کا جائزہ لے؟ کیا یہی وجہ تو نہیں کہ ہم ایسا شخص تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے جو خدا اور رسول ﷺ کے فرامین کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہو؟ ہم اللہ تعالیٰ کے فرامین اور اس کے رسول ﷺ کی سیرت کی روشنی میں شخصیت تلاش کرنے کی بجائے صرف زبان کے چسکے، خاندانی تعلق نبھانے کے پیچھے چل رہے ہوتے ہیں۔ ہم ان حضرات کے پاس حاضری کے وقت کیا واقعی فیض کے حصول کی غرض سامنے رکھتے ہیں؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم سالہا سال انہی لوگوں کی غلام گردش میں رہنے کے باوجود خدا کے قرب کی جانب ایک قدم بھی

نہیں اٹھا سکتے۔ لاہوری درویش نے کیا خوب کہا ہے:

شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

یاد رکھیے اگر آپ کسی زندہ یا فوت شدہ بزرگ کی صحبت میں سفر در وطن کی منزل طے کر رہے ہیں تو واقعی وہاں فیض ہے ورنہ آپ وہم کا شکار ہیں جس کی بنا پر اپنا وقت اور وسائل آگ میں جھونک رہے ہیں۔

میں پچھلے کافی عرصہ سے کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جس کا اللہ تعالیٰ پر توکل کامل اور محکم یقین ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میرے تعلقات ایسے افراد اور خانوادوں سے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا طریقت اور شریعت ہے۔ میں نے جس جس سے بات کی کہ ایسا کوئی شخص ان کی نظر سے گذرا ہو تو میں ان کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں سے جو جواب ملا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسے لوگ کتابوں میں ہی ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خاص کرم فرمایا اور مجھے ایسے ہی ایک شخص سے ملا دیا۔ دور دراز گاؤں میں مقیم، مکمل طور پر عزلت گزیں، گم نامی میں خوش، باتیں پُر اثر، صحبت پُر اطمینان۔ مرشد نے ایک بار کہہ دیا "شاہ صاحب! آپ میرے امام ہیں" اس کے بعد برس ہا برس تک شاہ صاحب باوضو رہے کہ شیخ کسی بھی وقت امامت کے لیے بلا لیں گے۔ زندگی امتحانوں سے پُر، لیکن کہنا یہ ہے کہ "اگر دعا قبول ہو جائے تو ایک بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہے، اور جب دعا قبول نہ ہو یا مرضی کے خلاف فیصلہ ہو جائے تو دو بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے نقصان سے بچا لیا ہے۔ کوئی سجادہ نشین انہیں اجازت وخلافت نہیں دیتا کیونکہ سجادہ نشینوں کی خلافتیں تو سیاسی ہوتی ہیں جبکہ اس خدا پرست انسان سے انہیں کسی قسم کی مالی یا افرادی یافت کی امید نہیں۔ میں نے پورا زور لگایا کہ سلسلہ بیعت شروع فرمائیں جیسا کہ ان کے مرشد نے سنت کے مطابق ان کو اپنا مصلا بخشا اور ان کی اقتدا میں نماز ادا کر کے انہیں اجازت

بخشی۔ اُن کا اصرار رہا کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں، اگر یہ کام کروانا ہوا تو جس طرح مرشد پہلے انہیں رہنمائی بخشتے ہیں اسی طرح خواب میں حکم دے دیں گے تب اس کے متعلق سوچوں گا۔

یہ تفصیل لکھنے کا مقصد آپ کو مزارات سے برگشتہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ باور کروانا ہے کہ ہم میں کسی بھی شخصیت یا مزار پر جانے سے قبل اتنی قابلیت ہونی چاہیے کہ وہ صاحب مزار شخصیت ہے کیا۔ وہاں نور ہے بھی یا نہیں؟ یا وہاں ظلمت ہے اور ہم ظلمت میں سے حصہ لے کر اور اپنا موجودہ نور بھی برباد کر کے تو واپس نہیں آرہے؟۔

کوئی ایسا مزار ہو یا زندہ شخص جس کے متعلق گمان ہو کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے فیض کی نعمت سے نوازا ہے اور وہ حصول فیض کا ذریعہ بھی ہے تو سب سے پہلے اس بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے کہ وہاں فیض ہے بھی یا ہم وہم کا شکار ہو گئے ہیں؟ مثلاً اگر کسی صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ بہت بڑے ولی اللہ ہیں اور ہم ان کے پاس کسب فیض کے لیے جاتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان حضرت کی حالت یہ ہے کہ عبادات میں اکثر مقامات پر سنتوں پر عمل پیرا نہیں ہیں، معاملات کا یہ حال ہے کہ دوسروں کا شرعی حق کھائے بیٹھے ہیں، نہ تو معاف کرایا اور نہ ہی ادا کیا۔ آپ خود سوچیے کیا ایسے شخص سے انوار اور فیض کا ورود ممکن ہے؟ پھر ہمارا یہ فیض محسوس کرنا چہ معنی دارد؟ یہی وہم ہے جس میں ہمارے عوام وخواص کی ایک بہت بڑی آبادی مبتلا ہو کر بے عمل ہو گئی ہے اور خود کو یا اپنے پیروں کو قلندر سمجھ کر نماز، روزہ اور زکوٰۃ جیسی فرض عبادات کے متعلق کہتے پھرتے ہیں کہ انہیں معاف کر دی گئی ہیں۔ نبی ﷺ کو تو نماز معاف نہیں، ان قلندر صاحب کو معاف ہے۔ معاذ اللہ من ذالک کسی بھی عالم سے پوچھ لیجیے کہ وہ شخص جو بقائم ہوش وحواس یہ دعویٰ کرے کہ اسے نماز معاف کر دی گئی ہے وہ مسلمان بھی ہے یا نہیں؟

آیئے اس کی کچھ مثالیں پیش کردوں:

اس فیض کے ورود کا احساس سب سے پہلے اپنے اوپر ہوتا ہے اور اس تواتر سے ہوتا ہے کہ وہم کا شائبہ تک نہ رہے۔ کامل پیر کی رہنمائی میں وہم اور ورودِ انوار کا فرق ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ جب تک

سالک کو یہ مقام حاصل نہ ہو تب تک مزار سے حصولِ فیض تو دور کی بات ہے بلا تحقیق ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا بھی ایمان کا جنازہ نکال سکتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

''اگر پیر سے کسی وقت خلافِ شریعت کام ہو جائے تو مرید کو چاہیے کہ اس امر میں پیر کی تقلید نہ کرے۔'' (مکتوب شریف نمبر 313 دفتر اول)

یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہمارے پیشہ ور پیر شریعت سیکھنے ہی نہیں دیتے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے استنجا، وضو کا طریقہ، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ اپنے پیر کی تقریروں یا صحبت سے سیکھا ہو؟ حضرت محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''ذکرِ خیر'' میں اپنے مرشد کامل حضرت توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں!

''ایک روز اس بات کا ذکر تھا کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے یا نہیں اور جو قبروں سے فیض لیتے اور اسے اویسیہ طریق بتاتے ہیں اس کا کیا حال ہے؟ حضور نے فرمایا ہاں فیض ہوتا ہے اور ہم نے بھی بہت قبروں سے فیض لیا ہے۔ ایک دفعہ ہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روح مبارک سے فیض لینے لگے بہت ہی فیض ہوا، خوب لذت آئی۔ ہمیں فیض لیتے لیتے کوئی دو اڑھائی گھنٹے لگ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میرے داہنے ہاتھ کی انگلیاں جھٹک کر فرمایا!! ''بس بھی کر''۔ پھر فرمایا کہ ہمارے اس ہاتھ کی انگلیوں میں تین دن تک درد رہا۔

فرمایا! ایک روز ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فیض لے رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ روحوں کا ایک گروہ آیا ہے اور ہمیں کہہ رہا ہے کہ ''یہ سید ہے۔'' میں نے خیال کیا کہ ان کو کس طرح معلوم ہوا؟ پھر ہمیں خیال آیا کہ یہ جو ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیض لے رہے تھے اور ہمیں اس میں فنا ہو گئی تھی اس فیض سے انہوں نے معلوم کیا کہ یہ سید ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ روحیں اس تجلی کی خادم ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیض ہے اس سے انہوں نے معلوم کیا۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''شہاب نامہ'' کے باب ''چھوٹا منہ بڑی

بات'' میں اپنا واقعہ نقل کیا ہے جس کی تلخیص کچھ یوں ہے: ایک بار مجھے کسی چھوٹے سے گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا جہاں ایک نیم خواندہ سے مولوی صاحب خطبہ دے رہے تھے۔ انہوں نے ایک داستان سنائی کہ حضور رسول کریم ﷺ جب اپنے صحابہ کرام علیہم الرضوان کی کوئی درخواست یا فرمائش منظور نہ فرماتے تو وہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی درخواست پیش کرتے کہ حضور ﷺ سے منظور کروالائیں۔ حضور نبی کریم ﷺ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایسی درخواست یا فرمائش خوشدلی سے منظور فرمالیتے۔

جمعہ کی نماز کے بعد کچھ نفل میں نے حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روح مبارک کو ایصالِ ثواب کی نیت سے پڑھ کر دعا مانگی: ''یا اللہ! میں درخواست کرتا ہوں کہ تو حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روحِ طیبہ کو اجازت مرحمت فرما کہ وہ میری ایک درخواست اپنے والد گرامی ﷺ کے حضور میں پیش کر کے منظور کروالیں۔ میں اللہ کی راہ کی تلاش میں مروجہ راستوں پر چلنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اگر سلسلہ اویسیہ واقعی حقیقت ہے تو مجھے اس سے استفادہ کرنے کی ترکیب اور توفیق عطا فرمائی جائے۔''

چھ سات ہفتے بعد اچانک میری جرمن بھابی کا ایک عجیب خط موصول ہوا۔ وہ مشرف بہ اسلام ہو چکی تھیں اور نہایت اعلیٰ درجہ کی پابندِ صوم و صلوٰۃ خاتون تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا:

The other night I had the good fortune to see "Fatimah" daughter of the Holy Prophet (Peace be Upon Him) in my dream. She talked to me most graciously and said, "Tell your brother in law Qudrat Ullah Shahab, that I have submitted his request to my exalted Father who has very kindly accepted it."

[ترجمہ: اگلی رات میں نے خوش قسمتی سے فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے میرے ساتھ نہایت تواضع اور شفقت سے باتیں کیں اور فرمایا کہ اپنے دیور قدرت اللہ شہاب کو بتادو کہ میں نے اس کی درخواست اپنے برگزیدہ والد گرامی ﷺ کی خدمت میں پیش کردی تھی۔ انہوں نے ازراہ نوازش اسے منظور فرمالیا ہے۔]

یہ خط پڑھتے ہی میرے ہوش وحواس پر خوشی اور حیرت کی دیوانگی سی طاری ہوگئی۔ یہ تصور کہ اس برگزیدہ محفل میں ان باپ بیٹی کے درمیان میرا ذکر ہوا، میرے روئیں روئیں پر ایک تیز وتند نشے کی طرح چھاجاتا تھا۔ دو تین دن میں اپنے کمرے میں بند ہو کر دیوانوں کی طرح اس مصرع کی مجسم صورت بنا بیٹھا رہا۔

مجھ سے بہتر ذکر میرا ہے کہ اس محفل میں ہے

جب تک سالک اس کیفیت کو نہ پہنچ جائے تب تک ہر معروف بزرگ کے پاس اس نیت سے بیٹھنا نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ جب تک انسان شہوت، غصہ، حرص ولالچ، بخل، حسد اور تکبر کے منفی اثرات سے دوچار ہے تب تک یہ نور وارد ہوتا رہتا ہے۔ ابتدائی طور پر اس نور اور وہم میں فرق کرنا ایک کڑا امتحان ہے۔ اس سے بھی مشکل اوپر بیان کردہ بیماریوں کے منفی اور مثبت اثرات کا ادراک اور ان میں فرق کرنا ہے۔ مبتدی (جس کی طریقت کی تعلیم میں ابھی ابتدا ہو) بسا اوقات حرص اور لالچ کو مثبت سمجھ رہا ہوتا ہے جبکہ وہ سالک کے ایمان کا جنازہ نکال کے رکھ دیتا ہے۔ آج ہمارے ہاں اس رہنمائی کے داعی ہر گاؤں، قصبے اور گلی محلے میں موجود ہیں (جن میں سے اکثریت پیشہ ور عاملوں کی ہے جو علم سے بے بہرہ اور کالے علم سے پیسہ کمانے کا اڈا کھولے بیٹھے ہیں۔ باقیوں نے تسخیر کا کوئی عمل سیکھ رکھا ہے اور اسے پیشہ کے طور استعمال کر رہے ہیں۔) جو لوگ رضاء الٰہی کے راستے کے متمنی اور خواہشمند ہیں وہ اپنے تئیں حقیقی مردان کمال کو تلاش کرتے تو ہیں لیکن تھک ہار کر خاندانی گدیوں کے سجادہ نشینوں پر اکتفا کرتے ہوئے اس غلام گردش میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خاص طور پر وہ گدیاں جہاں انتظام کی خوبصورتی، وقت بے وقت

کھانے کا اہتمام، لوگوں کی آمد و رفت اور بالخصوص اپنی تعریف میں شائع شدہ رسائل وغیرہ کی بہتات ہو۔ میں ایسے لوگوں کی تلاش میں بہت گھوما ہوں اور ایسے سینکڑوں لوگوں سے ملا ہوں لیکن ان میں سے صرف دو سجادہ نشین (خواجہ غلام سدید الدین اور حضرت پیر اعظم شاہ) ایسے تھے جو اپنی ذات میں مجھے کامل محسوس ہوئے لیکن دوسروں کو نوازنے کے معاملے میں صرف ایک حضرت کو کسی حد تک دسترس تھی۔ لیکن ان کے ہاں بھی سنتوں اور طریقت پر عامل جماعت نظر نہیں آئی۔ سیدا شریف میں میرے شیخ ابوالوفا حضرت صدیق احمد اس طرح کی ایک مختصر جماعت بنانے میں کامیاب ہوئے لیکن آپ علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد غالباً ہم جانشینان کی تربیت کی کمی کی بنا پر ان میں سے کئی ایک سالک و راغب طریقت میں مزید ترقی نہ کر سکے۔ اس کے باوجود اس جماعت کے زیادہ تر لوگ سنت ہائے نبوی ﷺ پر آخر تک کاربند رہے۔ میں ذاتی طور پر اسے بھی بڑی کامیابی تصور کرتا ہوں۔ حضرت خواجہ غلام فخر الدین سیالوی علیہ الرحمہ سیال شریف کے سجادہ نشین حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی تھے لیکن کمال میں تقریباً انہیں کے ہم پایہ تھے۔ ویسے بھی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مجھے کم ہستیاں ہی ایسی نظر آتی ہیں جن کی اولاد واقعی اس قابل ہو سکی کہ لوگوں کو فیض دینے کے قابل ہو۔ آپ تجربے کے لیے سجادہ نشینوں کے پاس حاضری دیں، آپ کو مندرجہ ذیل قسم کی گفتگو سننے کو ملے گی:

1۔ سیاست، گاڑیاں، پلاٹ، بڑے لوگوں سے تعلقات وغیرہ

2۔ تعویذات کے ذریعے کامیاب علاج کے تذکرے

3۔ بزرگوں کی غلط اور سچی جھوٹی حکایات، پر اثر لیکن بے سروپا ارشادات۔ مثلاً میں نے بہت عرصہ قبل ایک واقعہ سنا۔ ہمارے علاقے کے ایک گاؤں میں ایک حافظ صاحب کے پاس ایک گڈریا آیا کہ وہ جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اس کے والد نے شرط لگائی ہے کہ قرآن پاک حفظ کرو تو بیٹی کا ہاتھ دوں گا۔ اس عمر میں حفظ کرنا ممکن نہیں، کوئی تعویذ وغیرہ بنا دیں کہ شادی حسب منشا ہو جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ تم ظہر کی نماز میرے پیچھے پڑھنا۔ اس نے ظہر کی نماز ان

کے پیچھے ادا کی۔ نماز کے بعد اُن بزرگ نے دائیں طرف سلام پھیرا تو اس طرف والے نمازی حافظ ہو گئے، بائیں سلام پھیرا تو ادھر والے لوگ حافظ ہو گئے۔ ہم نے اس واقعہ کی بہت تحقیق کی مگر اس کی کہیں سے کوئی اصل نہیں مل سکی۔

4۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلقات اور وہ طریقے جو وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں ان سب کا رخ پیر کے آداب پر آ ختم کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت خواجہ سدید الدین رحمۃ اللہ علیہ معظم آبادی کے حوالہ سے درج ذیل واقعہ تواتر سے بیان کیا جاتا ہے کہ:

''سورۃ لہب نماز میں نہیں پڑھنی چاہیے کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے چچا کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ جس گستاخ رسول (ﷺ) کے ہاتھ ٹوٹنے کا حکم دے رہا ہے اور اس کے ہاتھ اس عبرت ناک انداز میں توڑے کہ اہلیانِ مکہ تو ایک طرف اس گستاخ کی اپنی سگی اولاد بھی پناہ مانگتی رہی، ہم اس کے چچا ہونے پر اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی سورۃ پڑھنے سے امت کو روکنے کی کوشش کر کے ''ثواب دارین'' میں ''حصہ دار'' بننے کے خواب دکھا رہے ہیں''۔

غالباً اس کے پیچھے یہ سوچ کارفرما ہے کہ گستاخِ رسول چچا کے احترام میں قرآن ترک ہو سکتا ہے تو پیر صاحب جو کہ نائب رسول (ﷺ) ہیں کے احترام کا عالم کیا ہونا چاہیے۔ یہاں حضرت صاحب معظم آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے الفاظ نقل کر دوں کہ انہوں کہا کیا تھا جنہیں بگاڑ کر ہم نے مریدوں کے دلوں میں اپنا جھوٹا سچا احترام پیدا کرنے کے لیے کیا سے کیا بنا دیا۔

حضرت صاحب علیہ الرحمہ نے فرمایا!

''قرآن کریم کی وہ آیات اور سورتیں جن میں عذاب اور سزاؤں وغیرہ کا ذکر ہے وہ جلالی ہیں اور جن میں رحم و کرم، جنت کی نعمتوں اور خوشخبریوں کا بیان ہے، ان کا مزاج جمالی ہے۔ سارا کلام خدا کا ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں لیکن بزرگانِ دین اکثر فرض نمازوں میں جمالی آیات اور سورتوں کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ یہ عمل بھی عشقِ الٰہی کے حصول کے لیے مجرب ہے۔ سورۃ لہب کم پڑھنی چاہیے (یہ نہیں فرمایا کہ بالکل نہیں پڑھنی چاہیے) کیونکہ اس میں قہرِ الٰہی کی

جھلک ہے اور ہر آیت دوسری سے بڑھ کر ہے۔ بندے کا کام تو اپنے رب کو راضی کرنا ہوتا ہے نہ کہ بار بار اس کے قہر و غضب کا ذکر کرنا۔" (ملفوظات شدید یاز: پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ معین الحق، اشاعت اول فروری 1990ء / رجب المرجب 1410ھ، صفحہ 64)

تبصرہ کرنے کی بجائے فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ بات تھی کیا اور کیا بنا دی گئی۔

اس تمام بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فیض خواہ زندہ سے لینا ہو یا صاحب مزار سے، پہلے سالک و راغب کو یہ مقام حاصل ہونا چاہیے کہ جس کے پاس حصولِ فیض کے لیے حاضر ہو رہا ہے اس کے سینے اور قبر میں نور ہے بھی یا نہیں۔ اگر اسے زندہ شخصیت کے متعلق ہی معلوم نہیں ہو پایا کہ اس کے سینے میں فیض ہے بھی یا نہیں جبکہ وہ سامنے ہے، اس کی صحبت میسر ہے، اس کے معمولات اور اعمال دیکھے جا سکتے ہیں تو فوت شدہ شخصیت جو خود منوں مٹی کے نیچے ہے، جسے آپ دیکھ نہیں سکتے اس کے متعلق فیض کی موجودگی کا از خود اندازہ لگا لینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے، آپ خود بہتر تبصرہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جب تک سالک اس مقام کو نہیں پہنچتا کہ:

وہم اور فیض میں امتیاز کر سکے

فیض کو یقین کی حد تک درست محسوس کر سکے

زندہ صاحب فیض سے اخذِ فیض کر سکے

تب تک اسے قبر سے حصولِ فیض کے معاملے میں بہت احتیاط برتنی چاہیے۔ اس مقام کے سالک کو چاہیے کہ ان چکروں میں پڑنے کی بجائے نماز، روزہ، احکام شریعت اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر عمل کرتا رہے اور ساتھ ساتھ اس دشت کی شناوری کے لیے بھی کوشاں رہے یہاں تک کہ اسے اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے صحیح ادراک عطا فرما دے۔

جس طرح حصولِ فیض کے لیے فیض لینے کا طریقہ اور اہلیت ضروری ہے اسی طرح فیض دینے کے لیے بھی فیض ہونے کے ساتھ ساتھ فیض منتقل کرنے کا طریقہ اور اہلیت ہونا ضروری ہے۔ ایک شخص نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر رکھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی شخصیت میں

پڑھانے کی اہلیت رکھی ہی نہیں تو وہ اتنا علم ہونے کے باوجود دوسروں کو منتقل کرنے سے قاصر رہے گا۔ اس کے مقابلے میں ایک کم پڑھا ہوا شخص جس کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے پڑھانے کی خوبی عطا فرمائی ہے اُسے ہر کوئی اچھا استاد کہے گا اور اُس سے استفادہ بھی زیادہ کرے گا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فیض لینے کے لیے ہمیشہ صاحب ارشاد کا مرید بننا چاہیے کیونکہ اس کے پاس فیض ہوتا بھی ہے، اور اُسے منتقل کرنے کا فن بھی آتا ہے۔ اس تمام بحث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ:

(1) بہت سے بزرگ ایسے ہیں جن کے پاس فیض ہوتا ہے مگر سالکین کو حاصل نہیں ہوتا یا اس کے حصول میں از حد محنت اور دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں مجذوب اور ملامتی بزرگ شامل ہیں۔ مجذوبوں کے ہاں جانے سے پرہیز کرنا چاہیے اگرچہ اخذ فیض کرنا آتا بھی ہو۔

(2) بہت سے مشہور مزارات ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق عوام الناس کا گمان ہوتا ہے کہ یہاں فیض کا انبار ہے جبکہ وہاں کچھ نہیں ہوتا بلکہ نور کی بجائے ظلمت ڈیرہ ڈالے بیٹھی ہوتی ہے۔ ان کی مثالیں پہلے بیان کر دی گئی ہیں۔

(3) چند مزارات ایسے ہیں جن کے متعلق جیسا مشہور ہوتا ہے ویسا ہی فیض ان کے ہاں ہوتا ہے اور ہر لینے والے کو ملتا بھی ہے۔ اس کی بہت سی ذاتی مثالیں میں نے عرض کر دی ہیں۔

مزار سے کسب فیض کا طریقہ:

1۔ کسی کامل کے مزار پر حاضری سے قبل نیت کرے کہ وہ کیوں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ میرے گمان میں جس مزار پر واقعی انوارات اور فیوض و برکات ہیں وہ صاحب مزار ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے **انعمت علیھم** فرمایا ہے لہٰذا یہ نیت کرلے "یا اللہ! تو نے جو انعامات اس شخص پر کیے ہیں ان میں سے مجھے بھی حصہ عطا فرما۔" جب مزار پر پہنچے تو اگر قدمین کی طرف راستہ ہو تو ادھر سے حاضر ہو ورنہ زور نہ کرے اور جہاں سے راستہ ملے وہاں سے حاضر ہو جائے۔

ہمارے ہاں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قبر کو چومنا چاہیے اور کچھ لوگ اسے مناسب نہیں سمجھتے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ قبر سے چار ہاتھ دور رہنا چاہیے [1] دیوبندی مکتبۂ فکر کے مستند عالم رشید احمد گنگوہی بھی حصولِ فیض از مزارات کو جائز سمجھتے ہیں۔ [2]

اگر صاحبِ مزار کے چہرہ مبارک کے سامنے جگہ خالی ہے تو وہاں بیٹھ جائیں ورنہ جہاں جگہ ملے وہاں تشریف رکھیں۔ یہاں قرآن پاک، کلمہ شریف، درود شریف یا جو سورتیں وغیرہ پڑھنا چاہیں ان کی تلاوت کر کے صاحبِ مزار کے لیے ایصالِ ثواب کر کے دعا مانگیں "یا اللہ! اپنے اس مقبول بندے پر تو نے جو انعامات فرمائے ہیں ان کا کچھ حصہ مجھے بھی عطا فرما۔"

اس کے بعد مکمل خاموشی اختیار کر کے مراقبہ فرمائیں۔ مناسب یہ ہے کہ پہلے "مراقبہ اسمِ ذات" [1] کریں۔ اور پھر "مراقبہ رحمۃ اللعالمین ﷺ" [2] فرمائیں۔ منتہی سالکین آخر میں

---

1) مزارات شریف میں حاضر ہونے میں پائنتی کی طرف سے جائے اور کم از کم چار ہاتھ کے فاصلے پر مواجہ میں (چہرہ کے سامنے) کھڑا ہو اور متوسط آواز (میں) باادب سلام عرض کرے۔ السلام علیک یا سیدی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پھر درودِ غوثیہ تین بار، الحمد شریف ایک بار، آیت الکرسی ایک بار، سورۃ اخلاص سات بار، پھر درودِ غوثیہ سات بار، اور وقت فرصت میں سورۃ یٰسین اور سورۃ الملک بھی پڑھ کر اللہ عزوجل سے دعا کریں کہ الٰہی اس قرأت پر مجھے اتنا ثواب دے جو تیرے کرم کے قابل ہے نہ اتنا جو میرے عمل کے قابل ہے۔ اور اسے میری طرف سے اس بندۂ مقبول کو نذر پہنچا۔ پھر اپنا مطلب جو جائز شرعی ہو اس کے لیے دعا کرے اور صاحبِ مزار کی روح کو اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ قرار دے۔ پھر اس طرح سلام کر کے واپس آئے، مزار کو نہ ہاتھ لگائے نہ بوسہ دے اور طواف بالاتفاق ناجائز ہے اور سجدہ حرام۔ فتاویٰ رضویہ؛ جلد نہم؛ باب الجنائز؛ مسئلہ نمبر 150؛ صفحہ نمبر 522؛ شائع کردہ رضا فاؤنڈیشن؛ جامعہ نظامیہ رضویہ؛ اندرون لاہوری دروازہ؛ لاہور۔

۲) رشید احمد گنگوہی صاحب فتاویٰ رشیدیہ میں "قبروں پر شرح صدر کی اصلیت" کے باب میں یوں رقم طراز ہیں: سوال: بعض صوفی قبور اولیاء پر چشم بند کر کے بیٹھتے ہیں اور سورۃ الم نشرح پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا سینہ کھلتا ہے اور ہم کو بزرگوں سے فیض ہوتا ہے۔ اس بات کی کچھ اصل بھی ہے یا نہیں؟

جواب: اس کی بھی اصل ہے، اس میں کوئی حرج نہیں اگر نیت خیر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

صاحب مزار کا مراقبہ کریں یعنی صاحب مزار کی طرف متوجہ ہو کر ان کے قلب کے نیچے اپنا قلب رکھ کر فیض لینے کی کوشش فرمائیں۔ مبتدی اور متوسط کو چاہیے کہ صاحب مزار کی بجائے اپنے مرشد کا تصور کرے کہ ان کے سینہ اقدس سے ایک نور میرے سینہ میں آ رہا ہے۔ اس بات کی دوبارہ تاکید کر رہا ہوں کہ صاحب مزار کی بجائے اپنے مرشد کا تصور کریں البتہ منتہی کے لیے آزادی ہے، صاحب مزار کا تصور کرے یا اپنے مرشد کا، یا دونوں کا۔ وہ لوگ جو لطائف اور حقائق کے اسباق سے گزر رہے ہوتے ہیں (اگر وقت اجازت دے تو) ان کے لیے بہتر ہے کہ اپنے لطائف اور حقائق یا جہاں تک کا وہ سبق لے چکے ہیں ان کا مراقبہ بھی کر لیں۔ متوسط اور منتہی سالکین یہ محسوس کرنے کی کوشش کریں کہ دوران مراقبہ کونسا لطیفہ زیادہ روشن ہوتا ہے اور کونسی حقیقت زیادہ واضح ہوتی ہے؟ ایک مزار پر متعدد بار حاضری کے بعد سالک کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ کس مزار سے کس مقام کا فیض حاصل ہوتا ہے۔ جو لوگ ابھی تک سلسلہ بیعت میں داخل نہیں ہوئے یا جنہیں اسباق شروع نہیں کرائے گئے ان کو مراقبہ اسم ذات اور مراقبہ رحمۃ اللعالمین ﷺ پر ہی اکتفا کرنا چاہیے اور صاحب مزار کی طرف متوجہ ہونے کی جرأت کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ جب مراقبات سے فارغ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے۔ یہ بات خاص طور پر ذہن نشین

---

۱) مراقبہ اسم ذات: اپنے دل کی دھڑکن کی طرف متوجہ ہوں، اسے غور سے سنیں اس سے **اللہ اللہ اللہ** کی آواز سنائی دے گی۔ زبان بند کر کے اس آواز کو سنتے رہیں۔ اگر مشکل پیش آئے تو اپنی کلائی پر نبض محسوس کریں اور زبان کے ساتھ **اللہ اللہ اللہ** کہیں۔ جب زبان اور نبض ایک ساتھ چلنا شروع ہو جائیں اس وقت زبان بند کر لیں اور دل کی دھڑکن پر غور کریں کہ نبض لفظ **اللہ** کہہ رہی ہے۔ یہ مراقبہ دن میں بھلے بہت مرتبہ کریں لیکن ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ تک ہی کریں۔

۲) مراقبہ رحمۃ اللعالمین ﷺ: تصور میں اپنے آپ کو روضہ مبارک رسول اللہ ﷺ کے سامنے لے جائیں اور آپ ﷺ کے روضہ اطہر سے آنے والے انوار کو اپنے قلب پر ڈالیں۔ آپ ﷺ کے ہاں کئی رنگوں کے انوارات مختلف اوقات میں وارد ہوتے ہیں اس لیے ادھر سے کسی رنگ کا نور آئے وہ انعام ہے، اسے دامن قلب میں سمو لیں۔

رہے کہ دعا معطیٔ حقیقی سمجھتے ہوئے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے مانگی جاتی ہے، رخ خواہ جدھر بھی ہو۔ ہاں البتہ صاحبِ مزار اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی دعا کی جلد قبولیت کا ذریعہ بنتا ہے۔

دعا مانگ کر جس طرح آپ حاضر ہوئے تھے اسی طرح وہاں سے واپسی کا راستہ اختیار کریں۔

لیکن یہاں ایک عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ میرا اپنا تجربہ ہے اور میں اس معاملہ میں سند کا درجہ نہیں رکھتا لہٰذا ہر شخص اپنی ذاتی استعداد کو استعمال کرتے ہوئے کوئی فیصلہ فرمائے۔ اللہ تعالیٰ مجھے سب وہموں سے اور شیطانی خیالات سے اپنے پناہ میں رکھے۔ آمین بحرمت سید المرسلین ﷺ۔

جن مزارات سے مجھے واقعی فیض ملا، ان میں سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مدینہ منورہ؛ حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ، العین، ابوظہبی؛ سلطان العارفین بایزید بسطامی، ایران؛ حضرت ابوالحسن خرقانی، ایران؛ ابوعلی فارمدی، ایران؛ حضرت سیدنا امام علی رضا، ایران؛ خواجہ محبوب عالم، سیدا شریف؛ سید حبیب اللہ شاہ، گجرات؛ خواجہ نور محمد مہاروی، چشتیاں شریف؛ شاہ سلیمان تونسوی؛ حضرت دوست محمد قندھاری، موسیٰ زئی شریف؛ حافظ عبدالکریم، عیدگاہ، راولپنڈی؛ محمد فاضل شاہ، گڑھی شریف (ٹیکسلا) سید رحمت علی شاہ، تلمبہ خانیوال؛ سید محمود شاہ گیلانی، کروڑ پکا؛ حضرت طاہر بندگی میانی صاحب، لاہور؛ سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش، لاہور؛ بابا فرید الدین گنج شکر، پاکپتن شریف؛ میر سید شفاعت علی بخاری، اسلام آباد؛ حضرت امین الدین مہمی، نانک پور، پاکپتن شریف؛ حضرت عین الدین، بھگوانپور، تحصیل دیپالپور؛ حافظ محمد عبداللہ، موضع بوہت، تحصیل پھالیہ۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ یہ بھی تجربہ میں آیا ہے کہ زیادہ تر بزرگوں کے ہاں کسی خاص حقیقت یا لطیفہ کا فیض وافر ہوتا ہے۔ دو حضرات کے ہاں تمام لطائف اور حقائق کے انوار بہ یک وقت اور بارہا محسوس ہوئے، یہ حضرات پیر مرید ہیں یعنی حضرت خواجہ محبوب عالم اور سید حبیب اللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہما۔ تین بزرگوں کے ہاں بالکل مختلف معاملہ نظر آیا، وہ یہ کہ مروجہ انوار کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کا اپنا نور بنا دیا ہے جو ان حضرات کے

ساتھ ہی مخصوص ہے۔ یہ حضرات ہیں سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش، حضرت خواجہ محبوب عالم اور حافظ محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہم۔

حضرت کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہ صحابی رسول ﷺ ہیں اور متحدہ عرب امارات کی سب سے بڑی امارت ابوظہبی کے شہر العین کے پرانے قبرستان میں مدفون ہیں جو اس شاہراہ پر واقع ہے جو العین شہر سے جبلِ حفیط کو جاتی ہے۔ مشہور مزار مبارک ہے، شہر میں کہیں سے پوچھیں تو پتہ چل جاتا ہے۔ العین میں حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک پر انوارات کا یہ عالم تھا کہ جس جانب اور جس جہت توجہ ہوئی وہ اپنی کیت و کیفیت کے اعتبار سے اس بندۂ ضعیف کے ہمت و حوصلے سے نہ صرف زیادہ تھے بلکہ بے حد و حساب اور اس کمزور روح کے لیے ناقابلِ برداشت بھی۔ روضہ رسول ﷺ کی حاضری کی کیفیات بیان سے باہر ہیں اور میرا فہم وادراک ان کے احاطہ سے قاصر ہے۔ البتہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فیض ہمہ گیر، ہمہ جہت اور ہمہ اوصاف ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رعب اور شریعت پر عمل کی شدت کے مقابلے میں اپنے کوتاہ عمل اور کم ہمتی کے پیشِ نظر چند بار توجہ ہوئی مگر شرم سے سر جھکا کر اور آنکھیں کھول کر اس جہاں میں واپس آ گیا۔ حضرت سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت ہی سخی، فیاض اور دل کھول کر عطا فرمانے والے ہیں۔ ان کی تفصیلات کہیں اور تحریر کروں گا۔ اتنا واضح کرنا شاید مناسب ہوگا کہ مجھے کس صاحبِ مزار پر کس فیض کا غلبہ نظر آیا۔ حضرت خواجہ محبوب عالم اور سید حبیب اللہ شاہ صاحب کے ہاں تمام لطائف اور حقائق بہ یک وقت اور ہمہ وقت موجود نظر آئے۔ حضرت پیر سید رحمت علی شاہ کے ہاں لطیفہ قلب کا غلبہ نظر آیا۔ اس کی confirmation بھی ہوئی۔

حضرت امین الدین بھی علیہ الرحمہ نانک پور پاکپتن شریف پر لطیفہ سِر کے نور کا غلبہ از حد جمال کے ساتھ ہے۔ حضرت عین الدین بھگوانپور تحصیل دیپالپور پر لطیفہ اخفیٰ کا غلبہ ہے لیکن اُن کے مزاج کا جلال ورودِ انوار میں از حد سرعت اور شدت کے نتیجہ میں زائر گھبرا جاتا ہے۔

[غالباً اسی وجہ سے ان کے ہاں زائرین کی آمد نہ ہونے کے برابر ہے۔] اگر سالک گھبراہٹ پر قابو پا کے ہمت کر جائے تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ حضرت طاہر بندگی علیہ الرحمہ اپنے سلسلہ کے لوگوں کی جانب زیادہ متوجہ ہوتے ہیں اور جس مقام کی سالک کو ضرورت ہو اسی سے نواز دیتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمہ ہمہ گیر ولایت کے حامل ہیں۔ ان کا اپنا ایک ذاتی نور ہے، جسے میں ''گنج بخشی'' فیض کہتا ہوں، ہر وقت وارد ہوتا رہتا ہے اور یہ نہایت ہی پر کشش ہے۔ مگر داتا حضور سے اپنی مرضی کا نور سالک کو اپنی ہمت سے لینا پڑتا ہے۔ گنج بخشی نور اس قدر پر کشش، پر اثر، پر از جمال اور لطیف ہے کہ اکثر سالکین کو اس میں مستغرق کر کے انھیں اپنے مقام اور اپنی ضرورت سے بھی بے خبر کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ سالکین جو اس کا ادراک رکھتے ہیں اور اس جانب توجہ دیتے ہیں، بہت کچھ حاصل کر کے نکلتے ہیں۔ آخر میں اپنی ایک عرض دہرانا چاہوں گا کہ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور میں ان معاملات میں سند کا درجہ نہیں رکھتا لہٰذا ہر شخص اپنی ذاتی استعداد کو استعمال کرتے ہوئے کوئی فیصلہ فرمائے۔

بقیہ: زبدۃ التحقیق کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

قول لینے سے دائرہ اہل سنت سے خارج نہیں ہوتا محل نظر ہے۔ اور اس مضمون میں یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ اگر اقوال متعارضہ ہوں تو ان پر عمل کرنے کے کون کون سے قواعد وضوابط ہیں۔ مزید یہ کہ اقوال متعارضہ میں اقوال کا ہم پلہ اور محل ایک ہونا ضروری ہے جبکہ محترم شاہ صاحب کے دلائل نہ تو سنداً معتبر ہیں اور نہ ہی یہ اقوال افضلیت ابوبکر صدیق کے متعارض ہیں۔ ان شاء اللہ ان متعارض اقوال کی تحقیق اگلے مضمون میں پیش کیں جائیں گی۔ اس مضمون میں بات واضح کر دی گئی ہے کہ اگر محترم قبلہ شاہ صاحب کے پیش کردہ اقوال متعارضہ کو بالفرض مان لیں تو پھر بھی یہ بات محل نظر ہے کہ کسی بھی قول کو ماننا صحیح ہوگا۔ کیونکہ ایک تو متعارض اقوال میں سے کسی ایک قول کو ماننے کے اصول حافظ ابن عبدالبر کی کتاب جامع البیان والعلم کے حوالے سے پیش کر دیے گئے ہیں اور حدیث ''اصحابی کالنجوم'' عند المحدثین بھی ضعیف ہے۔ محترم قبلہ شاہ صاحب کی پوری کتاب زبدۃ التحقیق انہی اقوال متعارضہ سے بھری پڑی ہے لیکن انہوں نے اس مسئلہ کو ظنی رکھا اور کسی ایک کے قول کو ماننے والے کو اہل سنت میں شمار کیا مگر جب شاہ صاحب کا اقوال متعارضہ میں سے کسی ایک قول ماننے والا موقف ہی صحیح نہیں تو پھر ان اقوال متعارضہ کو پیش کرنے کا کچھ فائدہ ہی نہیں اور اہم بات تو یہ کہ محترم قبلہ شاہ صاحب افضلیت ابوبکر صدیق کے قائل ہیں۔ محترم قبلہ شاہ صاحب نے جو اقوال متعارضہ پیش کیے ہیں ان کی حقیقت اور تجزیے کے لئے اگلے مضمون کا مطالعہ کیجئے گا۔ تا کہ حقانیت واضح ہو سکے اور دل کو طمانیت حاصل ہو۔

ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی

کچھ علم حدیث کے بارے میں (قسط 3)

علم حدیث سے ناواقف لوگوں اور صرف نام کے مسلمانوں کو اسلام کے خصوصاً حضور ﷺ کے دشمن جس راستے سے زیادہ گمراہ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں وہ حدیث ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج اس ترقی یافتہ دور میں ہم جہاں دنیاوی علوم کے لیے اپنے بچوں کو مہنگے اور اچھے سکولوں میں تعلیم دلواتے ہیں مشکل مضامین پڑھواتے اور سکھلاتے ہیں اس کا پچاسواں حصہ بھی علوم حدیث کا ہم اپنے بچوں کو نہیں سکھلاتے۔ اس کا حل یہ ہے کہ علوم حدیث کو عام کیا جائے اور اصل علم پھیلایا جائے اس لیے کہ اندھیرے کا سب سے بڑا علاج یہ ہے کہ روشنی کر دو اندھیرا ایک لمحہ دیر لگائے بغیر بھاگ جائے گا۔

ضعیف حدیث کا بیان:

لغوی تعریف: لغت کے اعتبار سے ضعیف قوی کی ضد ہے۔ ضعف حسی بھی ہوتا ہے اور معنوی بھی۔ یہاں ضعف سے مراد معنوی ضعف ہے۔

اصطلاحی تعریف: ہر وہ حدیث جس میں حدیث صحیح اور حدیث حسن کی مذکورہ صفات جمع نہ ہوں وہ حدیث ضعیف ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح صفحہ ۲۰ ، النوع الثالث معرفة الضعيفة من الحديث)

حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! "کل حدیث لم تجتمع فیہ صفات القبول"۔ ہر وہ حدیث جس میں صفات قبول جمع نہ ہو (وہ حدیث ضعیف ہے)

ضعیف حدیث کی اقسام: ضعیف حدیث کی چار اقسام ہیں۔

۱۔ پہلی قسم یہ ہے کہ اس کا ضعف اتنا کم ہے کہ اعتبار کے قابل ہے۔ مثلاً یہ ضعف اختلاط راوی سوئے حفظ، تدلیس کی وجہ سے ہے۔ تو یہ حدیث ضعیف متابعات اور شواہد کے کام آتی ہے۔ تلافی ضعف کے سبب پائے جانے سے قوت پا کر حسن لغیرہ بلکہ صحیح لغیرہ ہو جاتی ہے۔

۲۔ وہ ضعیف حدیث ہے جو راوی کے فسق وغیرہ کی وجہ سے متروک ہو۔ بشرطیکہ اب تک سرحد کذب میں

داخل نہ ہو۔ ایسی حدیث احکام میں لائق حجت نہیں البتہ مذہب راجح پر فضائل میں مقبول ہے۔

۳۔ وہ حدیث جس کا راوی کذاب وضاع یا جھوٹ سے متہم ہو۔ یہ حدیث ضعیف کی بدترین قسم ہے۔ بلکہ بعض محاورات کی بنا پر مطلقاً اور ایک اصطلاح پر اگر ان کا مدار کذاب پر ہو تو اس کو بھی موضوع کہتے ہیں۔ بنظر دقیق ان اصطلاحات پر یہ قسم موضوع حکمی میں داخل ہوگی۔

۴۔ یہ قسم بالاجماع نا قابل اعتبار ہے۔ یہاں تک کہ فضائل میں بھی اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ بلکہ اس کو حدیث بھی مجازاً کہتے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں یہ حدیث ہی نہیں۔

قارئین کرام کو اس بات کا خیال رہے کہ ضعیف کی پہلی دو قسموں کا حکم اور ہے اور آخری دو قسموں کا حکم اور ہے۔ یہاں پر ہی بدمذہب عوام کو دھوکہ دیتے ہیں اور ضعیف کا معنی موضوع کر دیتے ہیں۔ اور جب اپنی باری آتی ہے تو پھر اس کو یہ تمام قوانین یاد آجاتے ہیں۔

حدیث ضعیف فضائل میں معتبر ہے: حدیث ضعیف فضائل اعمال اور مناقب کے باب میں پہلی دو قسم معتبر ہیں۔ چنانچہ علامہ نووی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! ”قال العلماء من المحدثين والفقهاء و غيرهم يجوز و يستحب العمل فی الفضائل والترغيب والترهيب بالحديث الضعيف ما لم يكن موضوعا“۔ (الاذكار المنتخبة من كلام سيد الابرار للنووی صفحہ ۱۲)

ترجمہ: ائمہ محدثین و فقہاء اور دیگر علماء کرام فرماتے ہیں کہ فضائل اعمال اور ترغیب و ترھیب میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا مستحب ہے جبکہ موضوع نہ ہو۔

اسی طرح علامہ ابن حجر الہیتمی علیہ الرحمہ نے فضائل کے سلسلے میں حدیث ضعیف پر عمل کے لیے دلیل دیتے ہوئے کہا! ”قد اتفق العلماء على جواز العمل بالحديث الضعيف فی فضائل اعمال لانه ان كان صحيحا فی نفس الامر فقد اعطى حقه من العمل به والا لم يترتب على العمل به مفسدة تحليل ولا تحريم ولا ضياع حق للغير“۔ (الفتح المبین شرح اربعین)

ترجمہ: بے شک فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کے جواز پر علماء کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ یہ حقیقت میں صحیح ہے۔ تو اس پر عمل کرنے سے اس کا حق ادا ہو۔ ورنہ اس پر عمل کرنے سے حلال اور حرام بنانے اور دوسرے کے حق کو ضائع کرنے کا خطرہ نہیں ہے۔

فتح القدیر میں ہے! ''الضعیف غیر الموضوع یعمل به فی فضائل اعمال''۔

(فتح القدیر ۱/۳۰۳ مطبوعہ سکھر)

ترجمہ: فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا بس اتنا چاہیے کہ وہ موضوع نہ ہو۔

اسی طرح مقدمہ امام ابو عمرو ابن الصلاح و مقدمہ جرجانیہ و شرح الفیہ للمصنف و تقریب النواوی اور اسکی شرح تدریب الراوی میں ہے! ''محدثین وغیرھم علماء کے نزدیک ضعیف سندوں میں تساھل اور بے اظہار ضعف موضوع کے سوا ہر قسم حدیث کی روایت اور اس پر عمل فضائل اعمال وغیرہا امور میں جائز ہے۔ جنھیں عقائد و احکام سے تعلق نہیں۔ امام احمد بن حنبل و امام عبد الرحمن بن مہدی و امام عبد اللہ بن مبارک وغیرھم ائمہ سے اکی تصریح منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں جب ہم حلال و حرام میں حدیث روایت کریں تو سختی کرتے ہیں اور جب فضائل میں روایت کریں تو نرمی کرتے ہیں۔ (تدریب الراوی ۱/۲۹۸ مطبوعہ لاہور بحوالہ فتاوی رضویہ ۵/۴۸۱ مطبوعہ لاہور)

اس طرح مقاصد حسنہ صفحہ ۴۰۵، موضوعات کبیر ملا علی قاری ص ۶۳، قوت القلوب امام ابو طالب محمد بن علی المکی ۱/۳۳۶، مقدمہ ابن الصلاح ص ۴۹، کتاب الراوی محدث زکریا بن محمد شافعی، مرقات شرح مشکوٰۃ ۲/۸۳ میں ہے۔ تفصیل کیلئے فتاوی رضویہ جلد ۵ میں رسالہ ''منیر العین فی حکم تقبیل الابھامین'' مطالعہ فرمائیں۔

حدیث ضعیف کی تقویت کی وجوہ: ۱۔ کبھی حدیث ضعیف متعدد اسناد سے مروی ہو کر حسن لغیرہ اور کبھی صحیح لغیرہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ امام عبد الوہاب شعرانی فرماتے ہیں!

''بے شک جمہور محدثین نے حدیث ضعیف کو کثرت طرق سے حجت مانا ہے اور اُسے کبھی صحیح اور کبھی حسن سے ملحق کیا''۔ (میزان الکبریٰ للشعرانی الفصل الثالث ۱/۶۸ مطبوعہ مصر)

اسی طرح مرقات شرح مشکوٰۃ ۳/۱۸، الاسرار المرفوعہ فی اخبار الموضوعہ ص ۳۳۶، فتح القدیر ۱/۲۶۶، المیزان الکبریٰ للشعرانی ۱/۶۸، الصواعق المحرقہ ص ۱۸۴، التعقبات علی الموضوعات ص ۵۷ میں ہے۔

۲۔ کسی حدیث ضعیف پر اہل علم کا عمل اس کو حسن بنا دیتا ہے۔ یعنی علماء کاملین جس ضعیف حدیث پر عمل کرنا شروع کر دیں وہ ضعیف نہ رہے گی بلکہ حسن ہو جائے گی۔

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے! ''یعنی امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث غریب ہے اور اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ سید میرک نے امام نووی سے نقل کیا کہ اس کی سند ضعیف ہے تو گویا امام ترمذی عمل اہل علم سے حدیث کو قوت دینا چاہتے ہیں واللہ تعالیٰ اعلم''۔ (مرقات شرح مشکوٰۃ ۳/۹۸ مطبوعہ ملتان)

اسی طرح تعقبات ص ۱۲ میں ہے۔

۳) مجتہد جس حدیث ضعیف سے استدلال کرے تو اس کا استدلال بھی حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ ''ردّ المحتار'' میں فرماتے ہیں! ''ان المجتهد اذا ستدل بحديث كان تصحيحا له كما فى التحرير و غيره ''مجتہد جب کسی حدیث سے استدلال کرے تو اس کا استدلال بھی حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ جس طرح تحریر میں امام ابن ھمام نے فرمایا۔

۴) اسی طرح امام عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں! کبھی تجربہ اور کشف سے بھی ضعیف حدیث کو قوت مل جاتی ہے۔ جیسا کہ مرقات ۳/۲۲۲ و میزان الکبریٰ للشعرانی ۱/۳۵ میں ہے۔

ضعیف ترین سندیں: (۱)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے: ''صدقة الدقيقى ''عن فرقد السبخى عن مرة الطيب عن ابى بكر الصديق رضى الله عنه''۔

۲)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے: ''عمرو بن شمر عن جابر

الجعفی عن الحارث الاعور عن علی رضی اللہ عنہ"۔

۳)۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے:"السری بن اسماعیل عن داؤد بن یزید الأزدی عن ابیہ عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ"۔

۴)۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے:"نسخۃ عند البصریین الحارث بن شبل عن ام النعمان عن عائشۃ رضی اللہ عنہا"۔

۵)۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے:"شریک عن أبی فزارہ عن أبی زید عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ"۔

۶)۔حضرت انس رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے:"داؤد بن المحبر بن قحذم عن ابیہ عن أبان بن أبی عباش عن أنس رضی اللہ عنہ"۔(تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی ص ۱۱۲،۱۱۳)

موضوع روایت:

لغوی تعریف: موضوع "وَضَعَ" سے ماخوذ ہے۔جسکے معنی گرانے اور پھینکنے کے ہیں۔موضوع روایت کو اس لیے موضوع کہتے ہیں کہ یہ اپنے رتبے سے گر جاتی ہے اور پستیوں میں چلی جاتی ہے۔حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ "النکت" میں لکھتے ہیں!"جہاں تک لغوی معنی کا تعلق ہے تو ابو الخطاب ابن دحیہ کا کہنا ہے کہ موضوع کے معنی غلط طور پر منسوب بات ہے۔کہا جاتا ہے فلاں شخص نے دوسرے سے وضع کیا جو اس نے نہیں کہی۔اسکے معنی پھینکنا اور گرانا بھی ہے۔لیکن دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں۔

اصطلاحی تعریف: حافظ ابن الصلاح موضوع کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں!"ھو المختلق الموضوع" وہ گھڑی ہوئی بنائی روایت ہے۔(مقدمہ ابن اصلاح ص ۵۷)

ملا علی قاری علیہ الرحمہ شرح نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں!"الموضوع ھو الحدیث الذی فیہ

الطعن بکذب الراوی ''۔موضوع وہ حدیث ہے جس میں کذب راوی کی وجہ سے طعن ہو۔
(شرح نخبۃ الفکر لملا علی قاری ص ۴۷)

روایت کا موضوع ہونا کیونکر ثابت ہوتا ہے: امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! ''غرض ایسی وجوہ سے حکم وضع کی طرف راہ چاہنا محض ہوس ہے۔ہاں موضوعیت یوں ثابت ہوتی ہے کہ اس روایت کا مضمون:

۱) قرآن عظیم (۲) یا سنت متواترہ (۳) یا اجماع قطعی قطعیات الدلالۃ
۴) یا عقل صریح (۵) یا حس صحیح (۶) یا تاریخ یقینی کے ایسا مخالف ہو کہ احتمال تاویل وتطبیق نہ رہے۔ (۷) یا معنی شنیع وقبیح ہوں۔جن کا صدور حضور پرنور صلوات اللہ علیہ سے منقول نہ ہو۔جیسے معاذ اللہ کسی فساد یا عبث یا سفہ یا مدح باطل یا ذم حق پر مشتمل ہونا۔
۸) یا ایک جماعت جس کا عدد حد تواتر کو پہنچے اور ان میں احتمال کذب یا ایک دوسرے کی تقلید کا نہ رہے۔اس کے کذب وبطلان پر گواہی مستندا الی الحس دے۔
۹) یا خبر کسی ایسے امر کی ہو کہ اگر واقع ہوتا تو اس کی نقل وخبر مشہور ومستفیض ہو جاتی ۔مگر اس روایت کے سوا اس کا کہیں پتا نہیں۔
۱۰) یا کسی حقیر فعل کی مدحت اور اس پر وعدہ وبشارت یا صغیر امر کی مذمت اور اس پر وعید وتہدید میں ایسے لمبے چوڑے مبالغے ہوں جنہیں کلام معجز نظام نبوت سے مشابہت نہ رہے۔یہ دس صورتیں تو صریح ظہور ووضوح کی ہیں۔
۱۱) یا یوں ظہور ووضوح کیا جاتا ہے کہ لفظ رکیک وسخیف ہوں۔جنہیں سمع دفع اور طبع منع کرے اور ناقل مدعی ہو۔کہ بعینہا الفاظ کریمہ حضور افصح العرب ﷺ ہیں۔یا وہ محل ہی نقل بالمعنی کا نہ ہو۔
۱۲) یا ناقل رافضی حضرات اہل بیت کرام سیدھم وعلیھم السلام کے فضائل میں وہ باتیں روایت کرے جو اس کے غیر سے ثابت نہ ہو۔جیسے حدیث ''لحمک لحمی و دمک دمی'' (تیرا گوشت میرا گوشت تیرا خون میرا خون)

اقول۔ انصافاً یوں ہی وہ مناقب امیر معاویہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما۔ کہ صرف نواصب کی روایت سے آئیں کہ جس طرح روافض نے فضائل امیر المومنین واہل بیت طاہرین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں قریب تین لاکھ حدیثوں کے وضع کیں۔

''کما نص علیہ الحافظ ابو یعلیٰ والحافظ الخلیلی فی الارشاد'' جیسا اس پر حافظ ابو یعلیٰ اور حافظ خلیلی نے ارشاد میں تصریح کی ہے۔ یونہی نواصب نے مناقب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں حدیثیں گھڑیں ''کما ارشد الیہ الامام الذاب عن السنۃ احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ'' جیسا کہ اس کی طرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ نے رہنمائی فرمائی۔ جو سنت کا دفاع کرنے والے ہیں۔

۱۳) یا قرائن حالیہ گواہی دے رہے ہوں کہ یہ روایت اس شخص نے کسی طمع سے یا غضب وغیرہما کے باعث ابھی گھڑ کر پیش کر دی۔ جیسے حدیث سبق میں زیادت جناح اور حدیث ذم معلمین اطفال۔

۱۴) یا تمام کتب وتصانیف اسلامیہ میں استقرائے تام کیا جائے۔ اور اس کا کہیں پتہ نہ چلے۔ یہ صرف اجلہ حفاظ ائمہ شان کا کام تھا جس کی لیاقت صدہا سال سے معدوم ہے۔

۱۵) یا راوی خود اقرار وضع کر دے۔ خواہ صراحۃً خواہ ایسی بات کہے جو بمنزلہ اقرار ہو۔ مثلاً ایک شیخ سے بلا واسطہ بدعویٰ سماع روایت پھر اس کی تاریخ وفات وہ بتائے کہ اس کا اس سے سننا معقول نہ ہو۔ یہ پندرہ باتیں ہیں کہ شاید اس جمع وتلخیص کے ساتھ ان سطور کے سوا نہ ملیں۔ ''ولو بسطنا المقال علی کل صورۃ لطال الکلام و تقاضی المرام و لمسنا ھنالک بصدد ذلک۔ اگر ہم ہر ایک صورت پر تفصیلی گفتگو کریں تو کلام طویل ہو جائے گا اور مقصد دور ہو جائے گا۔ لہذا ہم یہاں اسکے درپے نہیں ہوتے''۔ (فتاوی رضویہ ج ۵، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲ مطبوعہ لاہور)

نقشہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

حدیث کے دو حصے ہیں
سند حدیث کے ۱۲ علوم
متن حدیث کے ۷ علوم
سند (روایت حدیث)
متن (درایت حدیث)
۱۔ معنعن
۲۔ مؤنن
۳۔ مسلسل
علو نسبی کی دو قسمیں ہیں (۴) سند عالی و نازل
علو مطلق
(۵) روایت الاکابر علی الاصاغر
(۶) روایت الاباء عن الابناء
(۷) روایت الابناء عن الاباء
(۸) روایت الاقران والمدبج
(۹) سابق ولاحق
(۱۰) علم جرح وتعدیل
(۱۱) علل حدیث
(۱۲) اسماء الرجال
(۱) غریب الحدیث
(۲) فقہ الحدیث
(۳) مختلف الحدیث
(۴) مشکل الحدیث
(۵) ناسخ الحدیث ومنسوخہ
(۶) اسباب ورود الحدیث
(۷) مصحف ومحرف
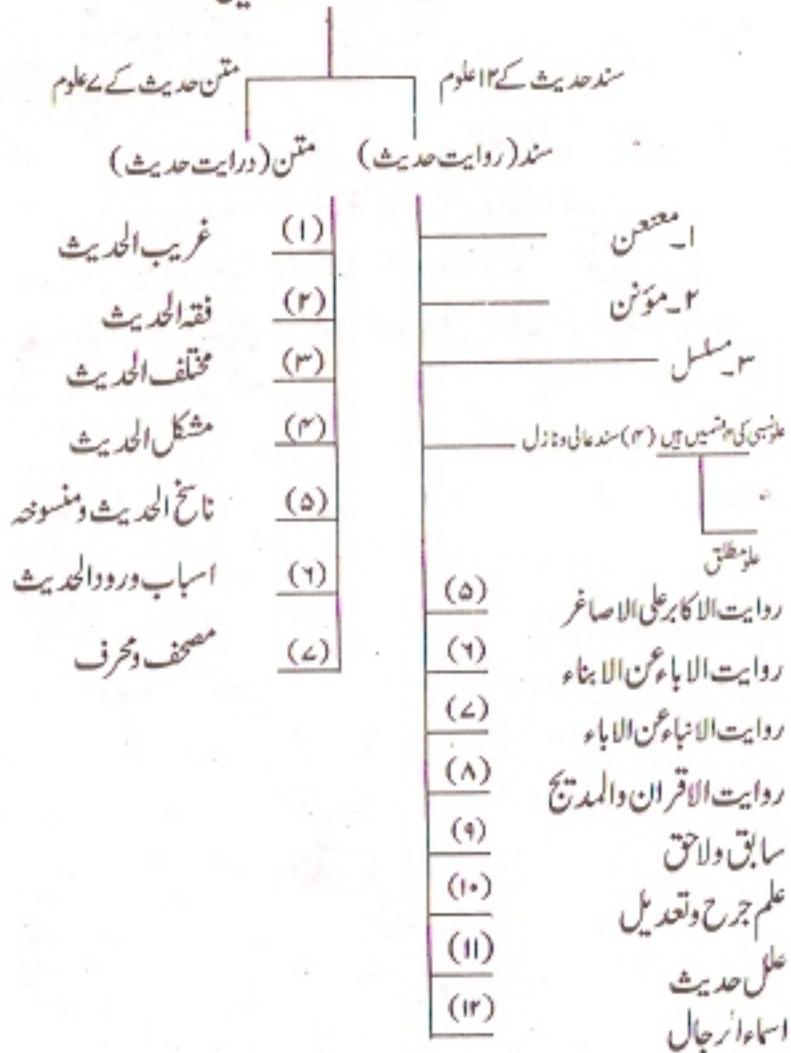
تحقیق وتحریر: فیصل خان☆

منحۃ الحی فی کشف ظلمات زبیر علی زئی (قسط نمبر 2)

امام شافعی اور مسئلہ تدلیس کی تحقیق:

ترک رفع یدین پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ضعیف ثابت کرنے کے لئے غیر مقلد زبیر علی زئی نے ہر ممکن کوشش کی مگر پھر بھی ناکام ہوئے۔ آخر کار عبدالرحمن معلمی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سفیان ثوری کی تدلیس ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اپنی ہی جماعت کے خلاف طبقات المدلسین کا انکار کر بیٹھے اور ہر مدلس راوی کی عن والی روایت کو ضعیف کہنا شروع کر دیا۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے زبیر علی زئی غیر مقلد نے امام شافعی رحمہ اللہ کا سہارا لیا۔ زبیر علی زئی غیر مقلد نے اپنی کتاب ''انوار الطریق ص ۱۰۹ تا ۱۳۹'' پر ''امام شافعی اور مسئلہ تدلیس'' کے نام سے ایک مضمون لکھا۔ فرماتے ہیں!

''امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوگیا کہ اس نے تدلیس کی ہے تو اس نے اپنی پوشیدہ بات ہمارے سامنے ظاہر کر دی (الرسالہ فقرہ: ۱۰۳۳)

موصوف مزید ارشاد فرماتے ہیں!

''اس کے بعد امام شافعی نے فرمایا: پس ہم نے کہا: ہم کسی مدلس سے کوئی حدیث قبول نہیں کرتے حتی کہ وہ حدثنی یا سمعت کہے (الرسالہ فقرہ: ۱۰۳۵)۔

اپنی تصنیف ''انوار الطریق ص ۱۱۱'' پر لکھتے ہیں!

''امام شافعی کے بیان کردہ اس اصول سے معلوم ہوا کہ جس راوی سے ساری زندگی میں ایک دفعہ تدلیس کرنا ثابت ہو جائے تو اس کی عن والی روایت قابل قبول نہیں ہوتی''۔

موصوف نے اس مضمون میں کل ۵۰ حوالہ جات پیش کیے ہیں۔ ان حوالہ جات کا مختصر سا حال کچھ

☆) 0321-5501977

یوں ہے۔

(i)۔ زبیر علی زئی غیر مقلد کے پیش کردہ حوالہ جات میں ۳۰ حوالہ جات محدثین کرام کے ہیں۔

(ii)۔ پیش کردہ محدثین کرام کے ان ۳۰ حوالہ جات میں ۲۰ حوالے ایسے محدثین کرام کے ہیں جنہوں نے صرف امام شافعی رحمہ اللہ کی ''کتاب الرسالہ'' والا قول ہی نقل کر کے سکوت اختیار کیا ہے۔ جس سے آپ ان حوالوں کی فنی حیثیت سے آگاہ ہو گئے ہوں گے۔ کیونکہ امام شافعی کے حوالہ پر محدثین کرام کا سکوت ہے اور یہ ۲۰ محدثین کرام صرف ناقل ہی ہیں اور کسی بات پر سکوت کو رضامندی سمجھنا تو خود زبیر علی زئی کو قبول نہیں ہے۔ اگر قبول ہے تو پھر زبیر علی زئی سے عرض ہے کہ جن محدثین کرام نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پر سکوت کیا تو اس کو بھی رضا مندی اور تصحیح کی دلیل سمجھیں۔ حالانکہ وہاں زبیر علی زئی نے سکوت کو تصحیح سمجھنے پر اعتراض کیا ہے یہ تو خود ان کا تضاد ہے۔ قارئین کرام حوالہ جات نقل کرنا ہی بات نہیں ہے۔ بلکہ ان کی بات اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگی جب تک کہ وہ طبقات کا انکار ثابت نہ کریں۔ مطلقاً ایسے حوالے نقل کرنا جس میں صرف امام شافعی کا اصول اور اس کی تائید ہو کیونکہ امام شافعی کے اصول میں حافظ ابن حجر اور دیگر محدثین نے تخصیصات ثابت کیں ہیں۔ لہٰذا جب تک وہ طبقات کا انکار ثابت نہیں کریں ایسے حوالہ جات فضول ہیں۔ حافظ ابن حجر نے خود النکت ص ۲۵۴ پر امام شافعی کا قول نقل کر کے طبقاتی تقسیم کی ہے۔

(iii)۔ زبیر علی زئی کے حوالوں میں ۵ حوالے علماء اہل سنت کے ہیں۔ جن کی حقیقت بھی آگے ملاحظہ فرمائیں۔

(iv)۔ زبیر علی زئی کے حوالوں میں ۵ حوالے علماء دیوبند کے ہیں۔ جن کا جواب تو پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔ مگر پھر بھی زئی صاحب نے عددی گنتی کی برتری ثابت کرنے کے لئے ان حوالوں کو درج کیا ہے۔ جو سراسر ہٹ دھرمی اور جھوٹ کا پلندہ ہے۔

امام شافعی کے قول کی تحقیق:

یوں ہے۔
(i)۔زبیر علی زئی غیر مقلد کے پیش کردہ حوالہ جات میں ۳۰ حوالہ جات محدثین کرام کے ہیں۔
(ii)۔پیش کردہ محدثین کرام کے ان ۳۰ حوالہ جات میں ۲۰ حوالے ایسے محدثین کرام کے ہیں جنھوں نے صرف امام شافعی رحمہ اللہ کی ''کتاب الرسالہ'' والا قول ہی نقل کر کے سکوت اختیار کیا ہے۔جس سے آپ ان حوالوں کی فنی حیثیت سے آگاہ ہو گئے ہوں گے۔کیونکہ امام شافعی کے حوالہ پر محدثین کرام کا سکوت ہے اور یہ ۲۰ محدثین کرام صرف ناقل ہی ہیں اور کسی بات پر سکوت کو رضا مندی سمجھنا تو خود زبیر علی زئی کو قبول نہیں ہے۔اگر قبول ہے تو پھر زبیر علی زئی سے عرض ہے کہ جن محدثین کرام نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پر سکوت کیا تو اس کو بھی رضا مندی اور تصحیح کی دلیل سمجھیں۔حالانکہ وہاں زبیر علی زئی نے سکوت کو تصحیح سمجھنے پر اعتراض کیا ہے یہ تو خود ان کا تضاد ہے۔قارئین کرام حوالہ جات نقل کرنا ہی بات نہیں ہے۔بلکہ ان کی بات اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگی جب تک کہ وہ طبقات کا انکار ثابت نہ کریں۔مطلقاً ایسے حوالے نقل کرنا جس میں صرف امام شافعی کا اصول اور اس کی تائید ہو کیونکہ امام شافعی کے اصول میں حافظ ابن حجر اور دیگر محدثین نے تخصیصات ثابت کیں ہیں۔لہٰذا جب تک وہ طبقات کا انکار ثابت نہیں کریں ایسے حوالہ جات فضول ہیں۔حافظ ابن حجر نے خود النکت ص ۲۵۴ پر امام شافعی کا قول نقل کر کے طبقاتی تفہیم کی ہے۔
(iii)۔زبیر علی زئی کے حوالوں میں ۵ حوالے علماء اہل سنت کے ہیں۔جن کی حقیقت بھی آگے ملاحظہ فرمائیں۔
(iv)۔زبیر علی زئی کے حوالوں میں ۵ حوالے علماء دیوبند کے ہیں۔جن کا جواب تو پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔مگر پھر بھی زئی صاحب نے عددی گنتی کی برتری ثابت کرنے کے لئے ان حوالوں کو درج کیا ہے۔جو سراسر ہٹ دھرمی اور جھوٹ کا پلندہ ہے۔

امام شافعی کے قول کی تحقیق:

اَب ہم نفس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ پہلے تو یہ عرض کروں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا ''کتاب الرسالہ فقرہ: ۱۰۳۵'' والے اصول کو مطلقاً اور کلیتاً اصول ماننا ہی غلط ہے۔ کیونکہ زبیر علی زئی خود اپنی کتاب ''انوار الطریق ص ۱۱۰'' پر اس اصول میں تخصیصات اور استثناء کے قائل ہیں۔ لہٰذا امام شافعی کے اصول کو ہمارے خلاف قاعدہ کلیہ بنا کر پیش کرنا اور عوام الناس کو مغالطہ دینا مردود اور باطل ہے۔ یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ امام شافعی کا اصول کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں تخصیص اور استثناء ہوسکتی ہے۔ ان تخصیص اور استثناء میں مندرجہ ذیل دیگر نکات بھی شامل ہیں:

(i)۔ مدلسین کے طبقات (ii)۔ تدلیس کی کمی وزیادتی

(iii)۔ ثقات سے تدلیس (iv)۔ طویل رفاقت

(v)۔ مخصوص اساتذہ وغیرہم

لہٰذا ان مندرجہ بالا تخصیصات کو امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے خلاف کہنا غلط اور جناب کے اپنے اصول کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی عرض کروں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا اپنا منہج بھی اس اصول سے ذرا ہٹ کر اور الگ ہے۔ کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی ''کتاب الرسالہ فقرہ ۱۰۳۵'' پر یہ صاف لکھا ہے کہ ہم مدلس کی صرف وہ روایات لیں گے جس میں **حدثنی یا سمعت** کا لفظ موجود ہو۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ نے متعدد مدلسین سے عن والی روایت نقل کیں ہیں۔ لہٰذا مندرجہ ذیل مدلس راویوں سے امام شافعی نے اپنی کتاب الرسالہ میں روایت کی ہیں۔

(i) محمد بن مسلم الزھری رحمہ اللہ (طبقہ ثالثہ کے مدلس): فقرہ ۵۱۴، ۵۳۳، ۵۶۱، ۹۵۹، ۶۶۰، ۶۹۱، ۶۹۶، ۷۳۸، ۷۵۲، ۷۷۵، ۸۱۱، ۸۸۶، ۹۰۹، ۱۱۲۶، ۱۱۷۲، ۱۱۸۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۵، ۱۳۷۳، ۱۵۷۲، ۱۷۴۱، ۱۷۱۱، ۱۷۱۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۸۳۲، ۸۴۰، ۸۴۳، ۸۶۳

(ii) محمد بن عجلان رحمہ اللہ: (طبقہ ثالثہ کے مدلس) الرسالہ فقرہ نمبر۔ ۳۷۷، ۱۰۹۰

(iii) ابن جریج رضی اللہ عنہ: (طبقہ ثالثہ کے مدلس) الرسالہ فقرہ نمبر۔ ۳۹۸، ۸۹۰، ۹۰۳

(iv) ابوالزبیر رضی اللہ عنہ: (طبقہ ثالثہ کے مدلس) الرسالہ فقرہ نمبر۔ ۳۹۸، ۸۹۰، ۸۸۹

(v) سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ: (طبقہ ثالثہ عند الفریقین مخالف) ۲۹۵، ۳۷۳، ۴۰۲، ۴۳۶، ۴۷۲، ۴۷۴، ۵۳۳، ۵۶۱، ۶۵۹، ۷۷۴، ۷۷۵، ۸۸۹، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۹، ۹۱۲، ۱۰۹۴، ۱۱۰۴، ۱۱۲۴، ۱۱۳۴، ۱۱۶۰، ۳۳، ۳۷، ۱۷۱، ۱۷۴، ۱۱۸۳، ۱۲۲۵، ۱۲۹۰، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۷۴، ۱۵۱۴، ۱۷۱۱، ۸۱۱، ۸۲۳، ۸۲۵، ۸۴۰، ۸۶۴، ۱۱۷۴، ۱۱۷۴

اس کے علاوہ کتاب الام ا مسند شافعی سے ہزاروں ایسے مقامات ہیں جہاں مدلسین کی عن والی روایت موجود ہیں۔

اعتراض: غیر مقلد زبیر علیزئی نے امام شافعی رحمہ اللہ کے اس مندرجہ بالا منہج کو غلط ثابت کرنے کے لئے دو وجوہات بیان کیں ہیں۔ زبیر علیزئی غیر مقلد انوار الطریق ص ۱۲۷ و ص ۱۲۸ پر لکھتا ہے۔

1: "امام شافعی کا اسنادہ صحیح وغیرہ کہنے کے بغیر مجرد روایت بیان کرنا حجت پکڑنا نہیں ہے۔

2: یہ ضروری نہیں ہے کہ مدلس کے سماع کی تصریح خود امام شافعی سے صراحتاً ثابت ہو بلکہ دوسری کتاب میں اس کی صراحت کافی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے مدلسین کی مرویات کے بارے میں علماء کرام کا عمل جاری وساری ہے۔

جواب: زبیر علی زئی کے یہ جوابات اصول کی روشنی میں کئی وجہ سے مردود اور باطل ہیں۔

اول: زبیر علی زئی غیر مقلد کا یہ جواب تحقیق نہیں بلکہ مناظرانہ ومنطقیانہ ہے لہذا مردود اور باطل ہے۔

دوم: زبیر علی زئی صاحب ذرا امام شافعی رحمہ اللہ کے ایسے حوالوں کی نشاندہی ان کی کتاب الرسالہ سے تو کریں۔ جہاں انہوں نے عن والی روایات کے بارے میں اسنادہ ضعیف لکھا ہو۔

سوم: زبیر علی زئی غیر مقلد کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں اسنادہ صحیح کہنا کا اسلوب ہی نہیں ہے۔

چہارم: امام شافعی رحمہ اللہ اگر اپنی کتاب الرسالہ میں عن والی روایت پر سکوت اختیار کریں تو غیر مقلد زبیر علی زئی کو اعتراض ہوتا ہے مگر زبیر علی زئی غیر مقلد نے محدثین کرام کے ۲۰ سکوتی حوالے امام شافعی کی کتاب الرسالہ فقرہ :۱۰۳۵ تائید میں جو دیے ہیں۔ اس پر رضامندی کیوں؟ لہذا معلوم ہوا کہ زبیر علی زئی غیر مقلد عوام الناس کو مغالطہ دے رہے ہیں۔

پنجم: زبیر علی زئی کا امام شافعی کی کتاب الرسالہ کو صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی طرح سمجھنا غلط ہے۔ اور یہ لکھنا کہ ''ضروری نہیں ہے کہ مدلس کی سماع کی تصریح خود امام شافعی سے صراحتاً ثابت ہو بلکہ دوسری کتاب میں اس کی صراحت کافی ہے جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے مدلسین کی مرویات کے بارے میں علماء کرام کا عمل جاری وساری ہے۔ حافظ زبیر صاحب کی یہ بات بالکل باطل و مردود ہے کیونکہ اول تو کتاب الرسالۃ کو صحیحین پر قیاس کرنا مردود ہے۔ دوسرا یہ کہ جس طرح صحیح بخاری و صحیح مسلم کے بارے میں محدثین کرام کے اقوال موجود ہیں اس طرح کے اقوال امام شافعی کی کتاب الرسالۃ کے بارے میں ثابت کرنا غیر مقلد زبیر علی زئی کے ذمہ ہے۔ لہذا ایسے حوالوں کی نشاندہی غیر مقلد زبیر علی زئی نے ہی کرنی ہے۔ اگر سچے ہیں تو کسی ایک محدث سے ثابت کریں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الرسالۃ کی عن والی روایات محمول علی السماع ہیں۔ مزید یہ کہ یہ بات خود امام شافعی رحمہ اللہ کے اپنے اصول کے مخالف ہے کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ مدلس راوی کی غیر مصرح بالسماع (عن والی روایت) لکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ لہذا زبیر علی زئی کا اعتراض واستدلال باطل اور مردود ہے۔

قارئین کرام مسئلہ صرف یہ ہے کہ کیا امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الرسالہ فقرہ ۱۰۳۵ والے قول پر خود عمل کیا ہے یا کہ نہیں؟ مگر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کا اپنا عمل اس قول پر نہ تھا۔

اعتراض: حافظ زبیر صاحب مناظرانہ طریق پر اپنی کتاب ''انوار الطریق ص ۵۷'' پر تحریر فرماتے ہیں!

''دوسرے یہ کہ امام شافعی نے کتاب الام میں محمد بن اسحاق بن یسار، ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی اور ولید بن مسلم وغیرھم کی معنعن روایات بھی بیان کی ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی مقبول التدلیس یا طبقہ ثانیہ میں سے تھے۔

جواب: عرض یہ ہے کہ زبیر علی زئی غیر مقلد کو یہ معلوم ہی نہیں کہ نفس موضوع کیا ہے، بات کیا چل رہی ہے اور وہ جواب کیا دے رہے ہیں؟ غیر مقلد زبیر علی زئی کے مندرجہ بالا تحریر سے تو یہ واضح ہو گیا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے خود مدلسین سے عن والی روایت لی ہیں جو امام شافعی کے اپنے اسلوب سے خلاف ہے۔

دراصل میں نے تو یہ گذارش عرض کی تھی کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الرسالہ فقرہ: ۱۰۳۵ کا جو قول آپ بار بار پیش کر رہے ہیں، اس قول پر ظاہراً امام شافعی کا اپنا عمل جاری و ساری نہیں ہے۔ لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کو ہمارے خلاف قاعدہ اور کلیہ بنا کر پیش کرنا غلط ہے۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ متعدد مقامات پر غیر مقلد زبیر علی زئی اس قول میں تخصیص کے قائل ہیں۔ اور یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے کسی مقام پر محمد بن اسحاق ولید بن مسلم کو طبقہ ثانیہ یا مقبول التدلیس نہیں کہا میں نے تو امام شافعی رحمہ اللہ کا منہج پیش کیا ہے کہ وہ بھی مدلس راوی کی عن والی روایت سے احتجاج کرتے ہیں۔ لہٰذا ان مناظرانہ جوابات سے نہ تو آپ کا مدعا حل ہوتا ہے اور نہ ہی جان خلاصی ہو سکتی ہے۔ یہ مناظرانہ جواب معصوم اور بھولے بھالے غیر مقلدین کو تو بھلے لگ سکتے ہیں۔ مگر دراصل ان جوابات کی نہ تو کوئی اصل ہے اور نہ ہی حقیقت اور مزید یہ کہ ان کے یہ مناظرانہ جواب بھی غلط اور مردود ہیں۔

اعتراض: جب زئی صاحب کو امام شافعی رحمہ اللہ کا منہج اور اسلوب سمجھایا گیا اور اس کا جواب دینے سے عاجز آ گئے تو موصوف نے بدتمیزی اور جارحانہ انداز میں کچھ یوں لکھا!

''کہ تم کون ہوتے ہو امام شافعی رحمہ اللہ کے اقوال میں تضاد ثابت کرنے والے؟ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ! کچھ تو شرم کریں۔ (انوار الطریق ص 75)

جواب: غیر مقلد زبیر علی زئی ذرا اپنی روش پر بھی دھیان دیں۔ اپنی جسارت کے بارے میں سوچیں، تم نے تو ائمہ اہل سنت پر الزامات اور بدتمیزی کا جو بازار گرم کیا ہے وہ بات تو قابل مذمت اور قابل شرم بات ہے۔ تم نے علماء اہل سنت کے بارے میں جو افتراء اور بہتان کی بارش کی ہے اس کی مثال تو کہیں نہیں ملتی۔ مگر جب جناب کو اپنے اصول کے مطابق بات سمجھائی تو جناب کو تو غصہ آ گیا۔ ہماری ہمت کو داد دیں کہ آپ کے اس طوفان بدتمیزی کا بڑے ہی ادب سے جواب دے رہے ہیں۔

حضور جواب سے عاجز ہیں تو میدان چھوڑ کر بھاگنے میں عافیت جانیں خوامخواہ ہر روز کے نئے اصول وضوابط وضع کرنے سے جان آسانی سے چھوٹ جائے گی اور علمی قابلیت کا بھرم بھی سر عام پھوٹنے سے بچ جائے گا۔

ذرا ''انوار الطریق ص ۴۴'' کو دوبارہ پڑھ کر دیکھ لیں کہ آپ نے حافظ ابن حجر کے بارے میں کیا لکھا ہے!

''یہ طبقاتی تقسیم خود حافظ ابن حجر کے اصول......... سے معارض ہونے کی وجہ سے بھی ناقابل قبول اور غلط ہے''۔

جناب آپ کون ہوتے ہیں حافظ ابن حجر کے اقوال میں تعارض ثابت کرنے والے؟ جب آپ کی اپنی مرضی کی بات ہو تو اقوال میں تعارض ثابت کرتے ہیں اور جب اپنی مرضی کے خلاف ہو تو پھر طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیتے ہیں۔ جناب آپ کو تو عادت ہے الزامی جواب دینے کی، مگر تحقیقی میدان میں ایسے حربے فضول ہیں۔

قارئین کرام! غیر مقلد (اہل حدیث) زبیر علی زئی صاحب کی اس بدتمیزی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان کے پاس میری بات کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ زبیر صاحب کی اس بدتمیز زبان کے بدلے ہم خوش اسلوبی سے بات کرنے کے قائل ہیں۔ لہذا عرض ہے کہ امام شافعی کے منہج سے بات جو سامنے آئی وہ عرض کر دی گئی ہے۔ اگر زبیر علی زئی صاحب عوام الناس کو

مغالطہ نہ دیتے تو ہم کبھی بھی یہ منہج سامنے نہ لاتے، دوسرا یہ کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ منہج میں نے نہیں بلکہ آپ کے سلفی مذہب اور غیر مقلدین علماء کرام نے مجھ سے بھی پہلے پیش کیا ہے۔ ان علماء کرام میں مندرجہ ذیل لوگ شامل ہیں:

(1) شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن بن سعید (منہج المتقدمین فی التدلیس، ص ۲۳)

(2) ناصر بن حمد الفہد (منہج المتقدمین فی التدلیس، ص ۱۶۳)

(3) شیخ محمد طلعت (معجم المدلسین، ص ۲۹)

(4) ابوعبیدہ مشہور بن حسن (شاگرد البانی) (جزء علم الحدیث)

(5) محمد خبیب احمد غیر مقلد (رسالہ محدث نومبر ۲۰۱۰ء)

(6) صالح بن سعید الجزائری (التدلیس واحکامہ، ص ۱۲۹)

لہذا صرف راقم پر اعتراض کرنا ناانصافی ہے کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے منہج سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مدلسین کی عن والی روایت لیتے تھے جو کہ ان کی اپنی "کتاب الرسالہ اور کتاب الام" سے ثابت ہے۔ اور یہ بھی عرض کردوں کہ کیا بذات خود زبیر صاحب نے متعدد مقامات پر جلیل القدر محدثین کرام مثلاً ابن حبان، حافظ ابن حجر اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ کے اقوال میں تضاد ثابت نہیں کیا ؟؟ اگر خود تضاد ثابت کریں تو عین اصول کے مطابق اور اگر ہم نشاندہی کریں تو آپ اسے بے ادبی سے تعبیر کریں۔ مشہور شعر ہے کہ

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا یا سراسر موم ہو یا سنگ ہوجا

جناب بات اصول کی روشنی میں ہی اچھی لگتی ہے۔ مجھ میں تو ائمہ کرام اور محدثین کرام کا ادب بھی ہے اور شرم بھی ہے۔ اور ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی شخص بشمول غیر مقلدین حضرات کی دل آزاری نہ ہو۔ یہ ایک علمی موضوع ہے لہذا اس موضوع پر علمی اور عالمانہ روش ہی بہتر ہے مجھے مطالعہ کے بعد جو چیز واضح ہوئی اسے عرض کردیا ہے۔ ماننا یا نہ ماننا یہ آپ کی اپنی مرضی ہے۔ مگر یہ عرض کردوں کہ جمہور علماء غیر مقلدین حضرات آپ کے موقف سے متفق نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کے

اپنے اساتذہ جن میں بدیع الدین شاہ راشدی اور محب اللہ شاہ راشدی صاحب بھی شامل ہیں جن سے آپ کی حدیث کی سند چلتی ہے آپ کی بات کے مخالف ہیں۔ بلکہ آپ کے استاد محب اللہ شاہ راشدی نے اپنے مضمون جو رسالہ ''الاعتصام'' میں چھپ چکا ہے آپ کو رجوع کرنے کا کہا تھا۔ مگر رجوع کیے بغیر ہی آپ اپنے خود ساختہ و مذمومہ اصول پر بضد ہیں۔

زبیر صاحب ''رسالہ الحدیث شمارہ نمبر ۶۷'' ، ''الفتح المبین ص ۴۳'' اور اپنی کتاب ''انوار الطریق ص ۵ و ص ۲۰۵'' پر سفیان بن عیینہ کی عن والی روایات کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

''بطور فائدہ عرض ہے کہ سفیان بن عیینہ سے امام شافعی کی تمام روایات سماع پر محمول ہیں'' (النکت الزرکشی ص ۱۸۹)

عرض یہ ہے کہ غیر مقلد زبیر علی زئی کو اپنے مذمومہ غلط اصول ثابت کرنے کے لئے یہ حق تو حاصل ہو کہ وہ علامہ الزرکشی رحمہ اللہ کے حوالے سے امام شافعی کی سفیان بن عیینہ (مدلس) سے عن والی روایات کو محمول علی السماع ثابت کرسکیں مگر ہمیں یہ حق حاصل نہ ہو کہ ہم حافظ ابن حجر اور حافظ علائی ا دیگر محدثین کرام کے منہج سے سفیان ثوری کی عن والی روایت کو صحیح مانیں۔ قارئین کرام کیا یہ علمی زیادتی نہیں کہ جب اپنا لوقف ثابت کرنا ہو تو پھر کوئی سا بھی قول قابل قبول اور اگر نہ ماننا ہو تو پھر دلائل کے انبار کا بھی رد کر دیا جائے۔ مزید عرض کروں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے طبقات المدلسین امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے خلاف نہیں بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے قول میں تخصیص اور استثناء ہے۔ لہذا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے طبقات کو جمہور کے خلاف کہنا باطل اور مردود ہے۔ زبیر علی زئی غیر مقلد حافظ الزرکشی کے حوالے سے سفیان بن عیینہ کی روایات کو محمول علی السماع کہہ کر تخصیص کا نام دیں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے طبقات کو جمہور کے خلاف کہہ کر رد کر دیں۔ کیا اسی کا نام تحقیق ہے؟ اگر یہ تحقیق ہے تو پھر آپ ہی کو مبارک ہو۔ یہاں یہ نکتہ عرض کروں کہ آخر وہ کونسا ایسا اصول ہے جس کی وجہ سے حافظ الزرکشی نے النکت ص ۱۸۹ پر امام شافعی رحمہ اللہ کی روایات کو سفیان بن عیینہ سے محمول علی السماع قرار دیا ہے۔ اس کا جواب دینا تو

زبیر علی زئی صاحب ہی کے ذمہ ہے تاکہ معاملہ واضح ہو سکے۔ یہاں ایک بات ذہن نشین کر لیں کہ زبیر علی زئی صاحب نے اپنی تصنیف ''انوار الطریق ص ۵ ـ ۷'' پر حافظ الزرکشی کے بارے میں لکھا ہے!''اول الذکر بات زرکشی ۷۹۴ھ نامی ایک عالم نے فرمائی ہے۔''

زبیر علی زئی صاحب نے اپنی تحریر میں محدث حافظ الزرکشی کو صرف زرکشی نامی ایک عالم لکھ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اگر حافظ الزرکشی معتبر محدث نہیں ہیں تو حافظ الزرکشی کا حوالہ بھی معتبر نہیں ہے۔ اور اگر یہ حوالہ معتبر نہیں تو پھر کتاب الرسالہ اور کتاب الام کی ان سینکڑوں روایات جو سفیان بن عیینہ سے عن سے مروی ہیں پر کیا حکم لگائیں گے؟ مزید یہ کہ کتاب الرسالہ اور کتاب الام کی عن والی روایات کے بارے میں یہ لکھنا کہ ''ان کی صراحت دوسری کتابوں میں ثابت ہیں'' بالکل غلط ہے۔ کیونکہ نفس موضوع امام شافعی کا تدلیس کے بارے میں اپنا منہج اور اسلوب ہے نہ کہ حدیث کی تصحیح اور تضعیف کرنا۔ یاد رہے کہ تدلیس کا منہج ہونا الگ بات ہے اور حدیث کی تصحیح یا تضعیف کرنا الگ ہے۔ لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کی تدلیس کے منہج کو حدیث کی تصحیح کے ساتھ گڈمڈ کرنا مردود اور باطل ہے۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ ''کتاب الرسالہ فقرہ: ۱۰۳۵'' کے قول کے مطابق امام شافعی مدلس کی عن والی روایت کو قبول نہیں کرتے مگر اس قول کے برخلاف امام شافعی رحمہ اللہ نے بہت سے مدلسین کو عن والی روایات کو اپنی کتاب الرسالہ میں روایت کیا ہے۔ امام شافعی کا اسلوب اور منہج ان کے اپنے قول کے مطابق مختلف ہے۔ لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کے قول اور دیگر محدثین کرام کے سکوتی حوالے پیش کر کے عوام الناس کو مغالطہ دینا باطل ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام کے سامنے امام شافعی رحمہ اللہ کا منہج اور اسلوب واضح ہو گیا ہے اور ان حوالوں کی حقیقت بھی واضح ہو گئی جن میں امام شافعی کے قول پر خاموشی اختیار کی۔ کیونکہ جب اصل قول ہی کا قاعدہ کلیہ نہیں تو فروع کی کیا حیثیت؟ لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کے قول سے عوام الناس کو مغالطہ دینا پرلے درجے کی ناانصافی ہے۔ (باقی آئندہ)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆
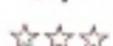
تحریر: ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی

اعلیٰ حضرت محدث بریلوی علیہ الرحمہ پر ایک اعتراض کا جواب

اعتراض: مولانا احمد رضا خان بریلوی نے "ملفوظات اعلیٰ حضرت حصہ دوم صفحہ نمبر ۲۷" میں عبد الرحمٰن قاری (صحابی رسول) پر فتویٰ کفر لگایا ہے۔

جواب: قارئین محترم! گزارش یہ ہے کہ عبد الرحمٰن قاری نام کا حضور نبی کریم ﷺ کا کوئی بھی صحابی نہیں ہے۔ کیونکہ اسماء الرجال اور خاص کر صحابہ کرام علیہم الرضوان پر جتنی بھی کتب لکھی گئی ہیں اس نام کے کسی صحابی کا ذکر موجود نہیں۔ اور اگر معترضین اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو کتب معتبرہ میں سے اس نام کے صحابی کے حالات زندگی اور اس کا سن پیدائش و وفات پیش کریں۔

مخالفین کی چال بازی: مخالفین عوام کو دھوکہ دینے کے لیے ایک نام پیش کرتے ہیں جن کا نام "عبد الرحمٰن بن عبد القاری" ہے۔ کیا عبد الرحمٰن قاری اور عبد الرحمٰن بن عبد القاری میں کوئی فرق نہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ دعویٰ کیا اور دلیل کیا؟۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مولانا الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ کے ملفوظات میں جس عبد الرحمٰن قاری کا تذکرہ ہے وہ کوئی اور شخص ہے اور عبد الرحمٰن بن عبد القاری کوئی اور ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس عبد الرحمٰن کا ذکر ملفوظات اعلیٰ حضرت میں موجود ہے وہ عبد الرحمٰن فزاری ہے اور رسول اللہ ﷺ کے مویشیوں پر ڈاکہ ڈالنے والا ہے۔ یہ واقعہ امام بخاری (صحیح بخاری باب غزوہ ذی القرد ۲/۶۰۳ و مترجم بخاری ۲/۱۵۲ طبع لاہور) کے مطابق غزوہ خیبر سے صرف تین روز پہلے پیش آیا۔ اسی طرح یہ بات صحیح مسلم باب غزوہ ذی القرد ۲/۱۱۳ و فتح الباری شرح بخاری ۷/۴۶۰ و شرح صحیح مسلم للسعیدی ۵/۵۹۷ میں بھی موجود ہے۔ اسی غزوہ میں عبد الرحمٰن فزاری صحابہ کرام کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اور یہ غزوہ ۷ ہجری کا ہے۔ اس غزوہ کے ہیرو حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے جو روایات مروی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

"حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی سواری کے اونٹ اپنے غلام رباح کے ہمراہ چرنے کے لیے بھیجے تھے اور میں (سلمہ بن اکوع) بھی ابوطلحہ (رضی اللہ عنہ) کے گھوڑے سمیت ان کے ساتھ تھا کہ اچانک صبح عبدالرحمٰن فزاری (جس کا ذکر ملفوظات اعلیٰ حضرت میں کیا گیا ہے) نے اونٹوں پر چھاپہ مارا اور ان سب کو ہانک کر لے گیا اور چرواہے کو قتل کر دیا۔ میں نے کہا! رباح یہ گھوڑا لو اور اسے ابوطلحہ تک پہنچا دو اور رسول اللہ ﷺ تک خبر دو۔ اور خود میں نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر مدینہ کی طرف رخ کیا اور یا صباحاہ!! تین مرتبہ پکارا پھر میں حملہ آوروں کے پیچھے چل نکلا اور ان پر تیر برساتا جاتا اور یہ رجز پڑھتا جاتا:

انا ابن الاکوع الیوم یوم الرضع

ترجمہ: میں اکوع کا بیٹا ہوں۔ اور آج کا دن دودھ پینے والے کا دن ہے۔

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بخدا میں انھیں مسلسل تیروں سے چھلنی کرتا رہا۔ جب کوئی سوار پلٹ کر میری طرف آتا تو میں کسی درخت کی اوٹ میں بیٹھ جاتا۔ پھر اسے تیر مار کر زخمی کر دیتا۔ یہاں تک کہ یہ لوگ پہاڑ کے تنگ راستے میں داخل ہوئے تو میں پہاڑ پر چڑھ گیا اور پتھروں سے ان کی خبر لینے لگا۔ اس طرح میں نے مسلسل ان کا پیچھا کیے رکھا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے جتنے اونٹ تھے میں نے ان سب کو اپنے پیچھے کر لیا۔ اور ان لوگوں نے میرے لیے ان اونٹوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ لیکن میں نے پھر بھی ان کا پیچھا جاری رکھا۔ اور ان پر تیر برساتا رہا۔ یہاں تک کہ بوجھ کم کرنے کے لیے انھوں نے تیس سے زیادہ چادریں اور تیس سے زیادہ نیزے پھینک دیے"۔

حاصل کلام یہ کہ اس لڑائی میں صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عبدالرحمٰن کو قتل کر ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا! "آج ہمارے سب سے بہتر شہسوار ابوقتادہ اور سب سے بہتر پیادہ سلمہ (بن اکوع) ہیں۔ اور آپ ﷺ نے مجھے دو حصے دیے ایک پیادہ کا اور ایک شہسوار کا اور مدینہ واپس ہوتے ہوئے (یہ شرف بخشا) کہ عضباء نامی اپنی اونٹنی پر اپنے پیچھے سوار فرما

لیا"۔(ماخوذ بخاری و مسلم، مدارج النبوت، زرقانی، سیرت ابن ہشام، زاد المعاد وغیرہ)

قارئین محترم! ذرا غور فرمائیں کہ یہ عبدالرحمٰن جس کا ذکر ملفوظات اعلیٰ حضرت میں کیا گیا ہے ۲ ہجری کے معرکے میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اور رہا عبدالرحمٰن بن عبد القاری تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ! اکثر محدثین نے عبدالرحمٰن بن عبد القاری کو تابعی تسلیم کیا ہے۔ صرف علامہ واقدی انھیں صحابہ میں شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے ان کو اُن لوگوں میں شمار کیا ہے جو عہد رسالت میں پیدا ہوئے مگر انھیں حضور ﷺ سے سماع حدیث کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ ان کی وفات ۸۱ ہجری میں ہوئی جبکہ ان کی عمر ۷۸ سال تھی۔ اس حساب سے انکی پیدائش ۳ ہجری ہے۔ تو کیا وہ چار سال کی عمر میں لڑنے گئے تھے؟۔ جیسا کہ "اکمال فی اسماء الرجال" میں ہے: "عبد الرحمن بن عبد القاری یقال انه ولد علی عهد رسول الله ﷺ ولیس له منه سماع ولا روایة وعده الواقدی من الصحابة فیمن ولد عهد رسول الله ﷺ المشهور انه تابعی وهو من جملة تابعی المدینة و علمائها سمع عمر بن خطاب مات سنة احد و ثمانین وله ثمان و سبعون سنة"۔ (مشکوۃ مع اکمال فی اسماء الرجال (اردو) ۳/۳۷۳ مطبوعہ لاہور)

ترجمہ: ان کا نام عبدالرحمٰن بن عبد القاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے لیکن نہ حضور ﷺ سے حدیث کی سماعت کی نہ روایت بیان کی۔ مؤرخ واقدی نے اُن صحابہ کے ذکر میں جو آنحضرت (ﷺ) کے زمانہ میں پیدا ہوئے ان کا بھی شمار کیا ہے۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ تابعی ہیں۔ مدینہ کے تابعین اور وہاں کے علماء میں سے ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی۔ ۸۱ھ میں بعمر ۷۸ سال وفات پائی۔

۲) ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! "عبد الرحمن بن عبد القاری ولد علی عهد النبی ﷺ وقیل به الیه وهو صغیر روی عن عمرو ابی طلحه وابی ایوب وابی هریرة---قال ابن معین ثقه--- وقال ابن سعد توفی بالمدینة

سنة ۸۵ ھ فی خلافت عبد الملك وھو ابن (۷۸) سنة ---اجلة تابعی اھل المدینة وعلمائھم ---وقال العجلی مدنی تابعی ثقه و ذکره مسلم وابن سعد وخلیفة فی الطبقة الاول من تابعی اھل المدینة "۔(تھذیب التھذیب ۷/۲۲۳ مطبوعہ بیروت)

۳)اسی طرح علامہ ابن اثیر نے اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ۳/ ۳۷۷،۳۷۸ مطبوعہ دار الفکر میں لکھا ہے۔علاوہ ازیں درج ذیل کتب میں بھی عبد الرحمٰن بن عبد القاری کے متعلق تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں:

۴)طبقات ابن سعد ۵/ ۵۷ (۵)طبقات خلیفہ ۲۳۶ (۶)ثقات العجلی ص ۳۳

۷)تاریخ البخاری الکبیر ۵/ الترجمہ ۹۸۸ (۸)علل احمد ۱/ ۲۵۷

۹)معرفۃ التاریخ ۱/ ۳۷۰ (۱۰)شذرات الذھب ۱/ ۸۸

(۱۱)خلاصۃ الخزرجی ۲/ الترجمہ ۴۱۷۲ (۱۲)معرفۃ التابعین صفحہ ۲۶

۱۳)تذھیب التھذیب ۲/ ۲۱۸ (۱۴)تھذیب الکمال ۱۷/ ۲۶۳

۱۵)تاریخ الاسلام ۳/ ۱۸۶ (۱۶)سیر اعلام النبلاء ۴/ ۱۳،۱۵

۱۷)تجرید اسماء الصحابہ ۱/ الترجمہ ۳۷۲۰ (۱۸)الکاشف ۲/ الترجمہ ۳۲۹۷

۱۹)العبر ۱/ ۹۲ (۲۰)ثقات ابن حبان ۵/ ۷۹ (۲۱)الجرح والتعدیل ۱/ الترجمہ ۱۲۳۳

ان تمام کتب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عبد الرحمٰن بن عبد القاری تابعی ہیں۔لہذا ملفوظات اعلیٰ حضرت میں جس عبد الرحمٰن کا ذکر ہے وہ یہ نہیں ہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ چلو صحابی نہ سہی تابعی کو کافر کیوں کہا؟

اس ضمن میں عرض ہے کہ ملفوظات اعلیٰ حضرت میں موجود عبد الرحمٰن کا ذکر تو عہد نبوی ﷺ سے ہے تو پھر وہاں تابعی کہاں سے آ گیا؟ بہر حال تابعی ہو یا صحابی یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ محدث بریلوی علیہ الرحمہ نے جس عبد الرحمٰن کو کافر کہا ہے یہ وہ شخص ہے۔اور جس کے کفری

کارنامے ملفوظات اعلیٰ حضرت حصہ دوم میں موجود ہیں۔ چند باتیں قارئین کی وضاحت کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

۱) یہ عبدالرحمن اپنے ہمراہیوں کے ساتھ حضور ﷺ کے اونٹوں پر آپڑا۔

۲) حضور ﷺ کے چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ لے گیا۔

۳) حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے اس کا تعاقب کیا۔

۴) اس عبدالرحمن کو حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا۔

گزارش دل: کیا حضور ﷺ کے اونٹوں کو لوٹنے والا صحابی یا تابعی ہوگا؟

کیا حضور ﷺ اور انکے صحابہ سے جنگ کرنے والا صحابی یا تابعی ہوگا؟

کیا حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے کسی صحابی کا تعاقب کیا؟

کیا حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے کسی صحابی یا تابعی کو قتل کیا؟

ہر ذی عقل وذی فہم ان سوالات کے جوابات کے بارے میں یہی کہے گا کہ ہرگز نہیں۔ غزوہ ذی قرد کے حالات وواقعات پڑھ کر سب کا یہی فیصلہ ہوگا کہ یہ عبدالرحمن ضرور بضرور اللہ اور اس کے رسول جل جلالہ وصلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن اور بدترین کافر تھا۔

ایک غلط فھمی اور اسکا ازالہ: ملفوظات اعلیٰ حضرت حصہ دوم میں عبدالرحمن کے نام کے ساتھ جو واقعات تفصیلا مذکور ہیں وہ واقعی طور پر اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ یہ عبد الرحمن بن عبدالقاری ہرگز ہرگز نہیں ہیں۔ اگر چہ اس کافر عبدالرحمن کی نسبت سامع یا جامع کی غلطی کی وجہ سے بدل گئی ہے۔ فزاری کی جگہ قاری ہوگیا ہے۔ صرف نسبت بدلنے سے مسمی نہیں بدلتا۔ اور ملفوظات میں صاحب ملفوظات کی عبارت بعینہ منقول نہیں ہوتی بلکہ یہ روایت بالمعنی ہوتی ہے اور سامع سے غلطی کا صادر ہو جانا ممکن ہے جیسا کہ اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

از قلم: علامہ پیر محمد تبسم بشیر اویسی ☆

اسلام میں گداگری کی ممانعت

عن عبد اللہ ابن عمران رسول اللہ ﷺ قال وھو علی منبر و ذکر الصدقہ والتعفف والمسئلۃ الید العلیا خیر من الید السفلیٰ فالید العلیا ھی المنفقۃ والسفلیٰ ھی السائلۃ۔ (بخاری جلد اول صفحہ 192، مسلم جلد اول صفحہ 332)

ترجمہ: "حضرت سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے منبر شریف پر تشریف فرما ہو کر ارشاد فرمایا صدقہ اور مانگنے سے بچنے کے متعلق اور مانگنے کی برائی ذکر فرمائی کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے اور نیچے والا ہاتھ سوال کرنے والا ہے۔"

صدقہ: زکوٰۃ تو فرض ہے اور وہ بھی صدقہ ہے لیکن وہ تو صرف صاحب نصاب پر لازم ہوتی ہے اس کے علاوہ صدقات نافلہ ہوتے ہیں جو کہ صاحب نصاب اور نصاب سے کم مالیت والے بھی کر سکتے ہیں ، بلکہ بعض صدقات فقراء اور مساکین بھی کر سکتے ہیں جیسا کہ تسبیحات و تکبیرات بھی صدقہ کا حکم رکھتی ہیں، بلکہ کسی سے ہنستے چہرے کے ساتھ ملنا بھی صدقہ ہوتا ہے اور یہ صدقات موجب اجر و ثواب اور بلیات و آفات کے ٹلنے کا سبب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ روایت میں ہے: علیکم بالصدقۃ فان اللہ تعالیٰ لید رأبالصدقۃ سبعین بابا من البلاء ایسرھا الجزام والبرص۔ "اپنے اوپر صدقہ لازم کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ کی برکت سے ستر دروازے بلاؤں کے دفع فرماتا ہے ان میں سے معمولی اور آسان دروازہ جذام (کوڑھ) برص (سفید داغ) ہے۔ (کشف الغمہ)

حضرت امیر المومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بادر وابالصدقۃ فان البلاء لا یتخطاھا۔ صدقہ کرنے میں جلدی کرو۔ بے شک بلائیں اس سے تجاوز نہیں کرتیں (یعنی ٹل جاتی ہیں)"۔ (مشکوٰۃ 167)

☆: 0300-6491308

ان مبارک حدیثوں سے ثابت ہوا کہ مصائب و بلیات اور آفات کا واحد علاج صدقہ ہے اور صدقہ کی برکت سے مصیبت ٹل جاتی ہے اور مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ صدقات گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں لیکن جس طرح ہر عمل میں اخلاص شرط ہے۔ اسی طرح صدقات بھی وہی نفع بخش اور فائدہ مند ہوتے ہیں جس میں اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب ہو اور اُن کو احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے کی وجہ سے ضائع نہ کر لیا ہو جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ لا تبطلو صدقاتکم بالمن والاذیٰ۔ اپنے صدقات احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے کے ساتھ باطل نہ کرو۔" جس پر صدقہ کرے اُس کا احسان جانے کہ اس نے صدقہ قبول کر لیا۔ اس پر احسان جتلانے اور اس کو حقیر جانے اُس کو تکلیف واذیت پہنچانے سے صدقہ کا اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

سوال کرنے کی مذمت: بغیر حاجت شدیدہ اور سخت مجبوری کے سوال کرنا اور لوگوں سے مانگنا سخت مکروہ اور ناپسندیدہ امر موجب ذلت و رسوائی ہے بلکہ چاہیے اپنے ہاتھ سے محنت و مشقت کر کے گزارہ کرے اور صبر و قناعت کرے۔ بلکہ اس طرح وقت گزارنا مانگنے کی ذلت سے ہزار درجہ بہتر ہے جیسا کہ بخاری اور مسلم شریف میں ہے: "عن ابی هریرہ رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال والذی نفسی بیدہ لان یأخذ احدکم حبله فیحتطب علی ظهرہ خیر له من ان یاتی رجلا فیساله اعطاہ و منعه ۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی شخص رسی پکڑے اور اپنی پیٹھ پر لکڑی کا گٹھا لاد کر لائے اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے پاس آئے اور اس سے سوال کرے، وہ اسے دے یا نہ دے۔" (بخاری و مسلم)

معلوم ہوا کہ محنت و مزدوری کر کے کمانا اور کھانا لوگوں سے مانگنے سے بچنا بہت بہتر ہے کیونکہ اس طرح نفس ذلیل و خوار ہوتا ہے اور اس کا وقار مجروح ہوتا ہے در بدر پھرنا اور گداگری کرنا اور گلیوں میں گھوم کر مانگنا اور طرح طرح کے حیلوں، بہانوں سے مانگنا اور جھوٹ بولنا، کبھی ماں باپ کی بیماری ظاہر کرنا اور کبھی بے گھر ہونے کا بہانہ بنانا اور مال جمع کرنا اور گداگری کو پیشہ بنا لینا بہت ہی معیوب امر اور

ذلت ورسوائی کا باعث اور آخرت میں تباہی وبربادی کا سبب ہے۔ حدیث میں ہے سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو لوگوں سے اپنا مال بڑھانے کے لیے سوال کرتا ہے وہ اپنے لیے (جہنم کے) انگاروں کا سوال کررہا ہے۔ (اب اس کی مرضی) خواہ کم سوال کرے یا زیادہ۔ اسی طرح ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں میں گھومتا رہتا ہے۔ لقمہ یا دو لقمے ایک کھجور یا دو کھجورے کر چلا جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکین کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اس کی ضروریات سے اس کو مستغنی کردے اور نہ اس کے آثار سے مسکینی وفقر کا پتہ چلے تاکہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ وہ لوگوں سے سوال کرتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

معلوم ہوا مسکین، فقیر وہ نہیں ہے جو مروجہ گداگری کرتا ہے اور دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے ہاں ایسا مسکین ہو جس کی نشاندہی حدیث میں کی گئی ہے جس کو اس کے حالات کا پتہ لگ جائے۔ وہ اس کی مدد کرے اور اس پر صدقہ کرے اور لوگوں سے تعاون کرائے تو وہ بہت بہتر ہے اور ایسے حاجت مند پر صدقہ کرنے کا بہت اجر وثواب ہے بغیر ضرورت اور حاجت کے مانگنا قیامت میں ذلت ورسوائی کا سبب ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انسان سوال کرتا رہے گا، حتیٰ کہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔ ان احادیث وروایات سے ظاہر ہوا لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور مانگنا، اور گداگری کو پیشہ بنانا دنیوی واُخروی ذلت ورسوائی کا سبب ہوگا اور مالداری کیلئے سوال کرنا ایسا ہے جیسے آگ کے انگاروں کا سوال کرنا اور مانگنے والا کل قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے ایسا ذلیل ورسوا ہوگا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ٹکڑا نہ ہوگا۔ اس مذکورہ حدیث میں بھی یہی ہے کہ آپ نے صدقہ کرنے پر ابھارا اور مانگنے کی برائی بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا: "اونچا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔" اللہ تعالیٰ اپنے راہ میں خرچ کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

مفتی محمد رضاء المصطفےٰ ظریف القادری☆
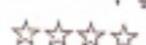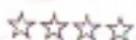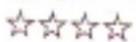
مسائل شرعیہ اور اُنکا حل

سوال: بعض سادات جب غیر سید سے بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں سید ہوں اور تو اُمتی ہے۔ اسی طرح بعض غیر سید جب سید سے مخاطب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں اُمتی ہوں اور آپ سید ہیں۔ یعنی اُمتی کے مقابلے میں سید اور سید کے مقابلے میں اُمتی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ شرعی طور پر اس بارے میں کیا حکم ہے۔ کیا سید اُمتی نہیں؟۔ (السائل: حافظ محمد صفدر)

الجواب: ایسا کہنا نہ سادات کے لیے جائز ہے اور نہ ہی غیر سادات کے لیے۔ سادات اور غیر سادات اُمتی ہونے میں سب برابر ہیں۔

سوال: دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (السائل: ظفر محمود قریشی)

الجواب: سلام کرنے سے پہلے یا بعد ہاتھ جوڑنا پاکستان کے بعض علاقوں میں مروج ہے اور کئی اہل علم بھی ایسا کرتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ بوقت ملاقات صرف مسنون طریقہ سے سلام و مصافحہ پر ہی اکتفا چاہیے۔ ہاتھ جوڑنا خلاف سنت ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ قرآن مجید کے پرانے اور پھٹے ہوئے نسخوں نیز ان کے بوسیدہ اوراق کی حفاظت کے لیے کونسا طریقہ اختیار کیا جائے؟۔ (تحفظ اوراق مقدسہ کے نام سے یہ فتویٰ مکتبہ قادریہ میلاد چوک سرکلر روڈ گوجرانوالہ سے مل سکتا ہے)

جواب: قرآن مجید یا اس کے اوراق پرانے اور بوسیدہ ہو جائیں اس قابل نہ رہیں کہ اُن سے تلاوت کی جا سکے اور یہ اندیشہ ہو کہ اوراق منتشر ہو کر ضائع ہو جائیں گے اُن کی حفاظت کے بارے کتب اسلامیہ میں تین صورتیں مذکور ہیں۔

جلانا، دھونا، دفنانا۔

چنانچہ مُلا علی قاری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں! ''مصحف کا بوسیدہ ورق جس سے کوئی فائدہ نہ رہ گیا ہو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ اُسے دھو ڈالنا بہتر ہے یا جلانا۔ ایک قول یہ ہے کہ جلانا بہتر

☆ دارالافتاء مرکزی جامعہ حنفیہ رضویہ سراج العلوم گوجرانوالہ

ہے کیونکہ دھونے میں ایک قسم کی اہانت یہ ہوگی کہ غسالہ پیروں تلے روندا جائیگا۔'' (مرقات ج ۲ ص ۶۳۱)

اور جلانے میں اس طرح کی کوئی اہانت نہیں ہوسکتی دوسرا قول یہ ہے کہ دھونا بہتر ہے اور غسالے کو کسی پاک جگہ بہا دیا جائے کیونکہ جلانے میں ایک طرح کی اہانت ہے۔

علامہ محمود عینی فرماتے ہیں! ''ہمارے علمائے حنفیہ نے فرمایا جب مصحف اتنا بوسیدہ ہو جائے کہ اس سے فائدہ نہ حاصل ہوسکے تو لوگوں کی پامالی سے دور کسی پاک جگہ دفن کر دیا جائے۔ (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۱۹)

فقیہہ ابی اللیث سمرقندی لکھتے ہیں! ''بوسیدہ مصحف پاک زمین میں دفن کیا جائے۔ جلایا نہ جائے۔'' (فتاویٰ النوازل ص ۲۰۷)

پانچ سو علماء کا فتویٰ: سلطان اورنگزیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے دور حکومت میں موصوف سلطان کے منتخب جلیل القدر پانچ سو علماء کے مرتبہ فتاویٰ میں ہے! ''مصحف جب پرانا ہو جائے اور اس سے تلاوت نہ ہوسکے تو اُسے آگ میں نہ جلایا جائے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۲۳)

اسی میں ہے! ''مصحف جب پرانا ہو جائے کہ اُس سے تلاوت نہ کی جاسکے اور اس کے ضائع ہونے کا خوف ہو تو پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے''۔ (حوالہ ایضاً)

علامہ شامی لکھتے ہیں! ''مجتبیٰ میں لکھا ہے کہ جب مصحف پرانا اور بوسیدہ ہو جائے تو اس کو دفن کرنا احسن ہے جیسے انبیاء کرام (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اور اولیاء (علیہم الرضوان) کو دفن کیا جاتا ہے اور باقی دینی کتابیں جب بوسیدہ ہو جائیں اور ان سے نفع نہ اٹھایا جاسکے تو ان کا حکم بھی یہی ہے اور دفن کرنا تعظیم کے خلاف نہیں کیونکہ لوگوں میں سے افضل حضرات (انبیاء و اولیاء) بھی دفن کیے جاتے ہیں اور ذخیرہ میں ہے کہ جب مصحف پرانا ہو جائے اور اس سے پڑھنا دشوار ہو جائے تو اس کو آگ میں نہیں جلایا جائے گا۔ امام محمد نے اسی طرف اشارہ کیا ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور مناسب یہ ہے کہ اُسے پاک کپڑے میں لپیٹا جائے اور اس کے لیے لحد بنائی جائے۔ اس لیے

کہ اگر اس کی قبر بطریق شق بنائی گئی تو اس پر مٹی گرے گی اور اس میں ایک قسم کی تحقیر ہے ہاں اگر اس کے اوپر چھت بنالی جائے پھر مٹی ڈالی جائے تو کوئی حرج نہیں اور اگر چاہے تو اسے پانی کے ساتھ دھولے یا کسی پاک جگہ رکھ دیا جائے جہاں نہ کسی بے وضو کا ہاتھ لگے نہ گرد و غبار پڑے نہ نجاست لگے اور نہ اس کی تعظیم میں فرق آئے تو یہ بھی جائز ہے۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۲۹۹)

امام سرخسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! ''مصحف کو آگ میں جلانا نہیں چاہیے اس لیے کہ ہوسکتا ہے اُس میں اللہ کے ذکر والی کوئی چیز ہو یا کلام اللہ کا کچھ حصہ ہو اور یہ بات مخفی نہیں کہ آگ میں جلانے میں اُسے حقیر جاننا ہے۔ (شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۱۰۳۹)

آپ کسی حنفی امام کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں! ''مصحف کو پاک جگہ دفن کرنے میں کوئی حرج نہیں''۔ (شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۱۰۵۰)

علامہ سید احمد طحطاوی حنفی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! ''مصحف سمیت تمام کتابوں کو جو لائق انتفاع نہ رہیں جاری پانی میں بہانے میں حرج نہیں یا دفن کردی جائیں اور دفن کرنا احسن ہے۔ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو دفن کیا گیا۔ (حاشیہ الطحطاوی ج ۴ ص ۲۱۰)

امام نووی شافعی علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں! ''جب (آیات قرآنیہ) کو لکڑی پر لکھا گیا تو اس لکڑی کو جلانا مکروہ ہے''۔ (التبیان فی آداب حملۃ القرآن) ص ۸۹۔۹۷)

علامہ سیوطی اور علامہ زرکشی لکھتے ہیں! ''قاضی حسین نے بوسیدہ اوراق کو جلانے کی ممانعت پر جزم فرمایا ہے اس لیے کہ یہ کام احترام کے خلاف ہے''۔ (اتقان ج ۲ ص ۲۲۱)

شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد حلوائی متوفی ۴۵۶ھ علامہ جصاص اور علامہ طاہر بن احمد صاحب خلاصہ متوفی ۵۴۲ھ علیہم الرضوان فرماتے ہیں! ''مصحف جب بوسیدہ ہوجائے۔ اُسے جلایا نہ جائے بلکہ اُس کے لیے زمین میں گڑھا کھود کر دفن کردیا جائے''۔ (واللفظ شمس الائمۃ بحوالہ البرہان فی علوم القرآن ج ا ص ۴۷۷)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ کا فتویٰ: مسئلہ: کیا

فرماتے ہیں علمائے دین وحامیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص متدین متبع سنت رسول ﷺ نے پارہائے کہنہ فرسودہ قرآن شریف اور قواعد بغدادی اور قواعد ابجد کو جولڑکوں کے دست مالش سے پھٹے ہوئے تھے اس مصلحت سے کہ ان کی بے ادبی نہ ہو اور پاؤں کے تلے نہ آویں بدون قصد توہین کے بسند حدیث بخاری کے جو باب جمع القرآن میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "امر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفۃ او مصحف ان یحرق" ان کو جلا دیا آیا یہ شخص اہل سنت کے نزدیک بلحاظ مصلحت وسند مذکور وادلہ شرعیہ کے صواب پر ہے یا خطا پر کتب معتبرہ سے جواب فرماویں۔ بینوا توجروا

الجواب: احراق مصحف بوسیدہ وغیر منتفع علماء میں مختلف فیہ ہے۔ اور فتوی اس پر ہے کہ جائز نہیں۔ قال فی الفتاوی عالمگیریۃ المصحف اذا صار خلقا و تعذر القرأۃ منہ لا یحرق بالنار اشار الشیبانی الی ھذا فی السیر الکبیر و بہ ناخذ کذافی الذخیرۃ بلکہ ایسے مصاحف کو پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کرنا چاہیے۔ فیھا ایضاً المصحف اذا صار خلقا لا یقرؤ منہ و یخاف ان یضیع یجعل فی خرقۃ طاھرۃ و یدفن و دفنہ اولیٰ من وضعہ موضعا یخاف ان یقع علیہ النجاسۃ و نحو ذلک و یلحد لہ لانہ لو شق و دفن یحتاج الی اھالۃ التراب علیہ و فی ذلک نوع تحقیر الا اذا جعل فوقہ سقف بحیث لا یصل التراب علیہ فھو حسن ایضا کذا فی الغرائب اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے کہ احراق واقع ہوا کما فی حدیث البخاری بغرض رفع فتنہ وفساد تھا اور بالکلیہ رفع اوس کا اسی طریقہ میں منحصر کہ صورت دفن میں ان لوگوں سے جنھیں مصاحف محرقہ اور ان کی ترتیب خلاف واقع پر اصرار تھا احتمال اخراج تھا بخلاف مانحن فیہ کہ یہاں مقصود حفظ مصحف ہے۔ بے ادبی اور ضائع ہوجانے سے اور یہ امر طریقہ دفن میں کہ مختار علماء ہے کما مر بنھج احسن حاصل البتہ قواعد بغدادی وابجد اور سب کتب غیر منتفع بہا ماورائے مصحف کریم کو جلا

دینا بعد محو اسمائے باری عزاسمہ اور اسمائے رسل ملائکہ صلی اللہ تعالیٰ علیہم وسلم اجمعین کے جائز ہے۔ کما فی الدرر المختار الکتب التی لا ینتفع بھا محی عنھا اسم اللہ و ملائکۃ و رسولہ ویحرق الباقی واللہ تعالیٰ اعلم و علمہ عزاسمہ اتم معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے ناقابل استعمال پرانے نسخے اور بوسیدہ اوراق کی حفاظت جس سے اسکا تقدس اور ادب زیادہ محفوظ رہ سکے یہی ہے کہ ایسے نسخوں اور اوراق کو کسی بہتر اچھے طریقے سے دفن کیا جائے پانی چونکہ مختلف پاک ناپاک جگہ سے گذرتا اور ٹھہرتا ہے حتیٰ کہ جانور تک اس میں پیشاپ وگوبر کرتے ہیں انسان پاکی ناپاکی کی حالت میں نہاتے اور کپڑے دھوتے ہیں لہذا پانی میں نہ بہائے جائیں جہاں تک جلانے کا تعلق ہے اسے جہاں علماء نے ناپسند فرمایا ساتھ ہی عوام الناس بھی ایسے فعل کو اچھا تصور نہیں کرتے ایسے فعل کے مرتکب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

چنانچہ رسم المفتی ''من لم یعرف احوال زمانہ فھو جاھل ''یعنی جو شخص احوال زمانہ سے بے خبر ہو وہ جاہل ہے کہ مطابق علماء کو چاہیے کہ وہ ہرگز جلانے کا فتویٰ نہ دیں۔

دور عثمانی میں احراق مصاحف: پرانے مصاحف واوراق کو جلانے کے جواز کے قائل حضرات حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں مصاحف کے جلانے کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کا پس منظر یہ ہے کہ اسلام کا دائرہ جب وسیع ہو گیا تو جن مسلمانوں نے قرآنی آیات کو جس اُستاد سے جس طرز تلفظ اور قرأت سے سیکھا تھا ان میں اور دوسرے اُن مسلمانوں میں جن کو دوسری قرأت میں تعلیم دی گئی تھی اختلاف پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ حضرت حذیفہ نے حضرت عثمان سے کہا اس اُمت کو سنبھالو اس سے پہلے کہ ان میں یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح اختلاف پیدا ہو۔ (بخاری ج ۲ ص ۷۴۶، اتقان ج ۱ ص ۸۱، مناہل العرفان ج ۱ ص ۲۵۲)

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مسئلہ صحابہ کرام کے سامنے پیش کیا اور صحابہ کے اتفاق پر آپ نے حضرت حفصہ کے گھر سے وہ نسخہ منگوایا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے

دور میں لکھا گیا تھا اور قرآن مجید کے وہ نسخے نذرِ آتش کر دیے جو مختلف حضرات کے پاس موجود تھے۔

جلانے کی وجوہات و اسباب: شارح بخاری علامہ کرمانی علیہ الرحمہ اس جگہ لکھتے ہیں! ''اگر تو کہے کہ قرآن مجید کو جلانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ جلایا وہ گیا تھا جو منسوخ تھا یا جو غیر قرآن کے ساتھ خلط ملط ہو چکا تھا۔ (کرمانی ج ۱۸ ص ۹، عمدۃ القاری ج ۲۰ ص ۱۸)

ملا علی قاری فرماتے ہیں! ''حضرت عثمان نے نذرِ آتش اُسے کرایا جو قرآن نہ تھا یا قرآن سے اتنا خلط ملط ہو گیا تھا کہ اُسے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور انھوں نے جلانے ہی کو اس لیے ترجیح دی کہ اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے کہ انھوں نے کچھ قرآن چھوڑ دیا کیونکہ اگر وہ قرآن (غیر منسوخ) ہوتا کوئی مسلمان اُسے جلانا روا نہ رکھتا۔ (مرقات ج ۲ ص ۶۳۱)

ابن ابی داؤد اور طبرانی نے شعیب سے روایت کی ہے! ''جناب عثمان نے ہر وہ مصحف نذرِ آتش کرنے کا حکم دیا جو ان مصاحف کے خلاف تھا جنھیں بلادِ اسلامیہ میں بھیجا گیا''۔ (بحوالہ فتح الباری ج ۹ ص ۱۷، کتاب المصاحف ص ۲۷، سجستانی ''اتحیان'' ص ۲۹)

علامہ کرمانی فرماتے ہیں! ''وہ مصاحف نذرِ آتش کیے گئے جن میں غیر قرآن، قرآن سے مخلوط تھا یا قرأت شاذہ یا وہ قرأتیں تھیں جو منسوخ ہو چکی تھیں انھیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس لیے نذرِ آتش کرایا کہ اختلاف ختم ہو جائے''۔ (کرمانی ج ۱۸ ص ۹)

اور آئندہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص ان مصاحف کو پیش کر کے مسلمانوں میں پھر اختلاف و انتشار پیدا کرے اور انھیں ایک قرآن اور ایک زبان پر جمع نہ رہنے دے۔ معلوم ہوا کہ آپ کا یہ اقدام نظریہ ضرورت کے تحت تھا اور شریعت کا مشہور قاعدہ ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات ضرورتیں ممنوعات کو جائز بنا دیتی ہیں۔

علامہ قاضی عیاض کی تحقیق: علامہ ابن حجر اور علامہ عینی لکھتے ہیں! ''قاضی عیاض نے اس بات پر وثوق فرمایا ہے کہ لوگوں نے پہلے انھیں پانی سے دھویا پھر انھیں جلایا تاکہ اچھی

طرح تلف ہو جائیں"۔ (عمدۃ القاری ج ۲۰ ص ۱۸)

علامہ ابن حجر کی رائے : آپ فرماتے ہیں! "جلانے کا حکم اس وقت سے متعلق تھا بہر حال اب اگر ضرورت ہو تو دھونا ہی اولیٰ ہے"۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۱۷)

علامہ عینی بھی یہی فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو (عمدۃ القاری ج ۲۰ ص ۱۹)

البتہ علماء احناف کا مؤقف یہ ہے کہ دھونے کی نسبت دفنانے میں زیادہ ادب ہے۔ اور اسی صورت کو عرف میں بھی زیادہ باعث ادب تصور کیا جاتا ہے۔ اور قاعدہ بھی یہی ہے کہ انما العبرة فی الادب للعرف۔ ادب میں اعتبار عرف کا ہے۔ اسی عرف کے اعتبار کی وجہ سے مسجد میں جوتا پہنے جانا بے ادبی ہے۔ حالانکہ صدر اول میں یہ حکم نہ تھا۔ چنانچہ فتاویٰ سراجیہ اور عالمگیریہ میں ہے دخول المسجد متنعلا مکروہ مسجد میں جوتا پہنے داخل ہونا مکروہ ہے۔ عمدۃ المفتیین ورد المختار میں ہے دخول المسجد متنعلا من سوء الادب مسجد میں جوتا پہنے جانا بے ادبی ہے بوسیدہ اوراق و پرانے مصاحف کے جلانے کو عرف میں بے ادبی پر محمول کیا جاتا ہے۔ لہذا انھیں جلانے کی بجائے دفنایا جائے۔

کسی نے انکار نہ کیا : مصعب بن سعد سے روایت ہے! "فرمایا میں نے بکثرت لوگوں کو اس وقت پایا جب عثمان نے مصاحف نذر آتش کرائے سب نے اسے پسند کیا اور کسی نے انکار نہ کیا"۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۱۷، عمدۃ القاری ج ۲۰ ص ۱۸، کنز العمال ج ۲ ص ۲۸۱ کتاب المصاحف ص ۱۹)

حضرت علی رضی اللہ عنہ **بھی یہی کرتے** : حضرت عمر بن سعید سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں! "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر حضرت عثمان کے وقت میں حاکم ہوتا تو مصاحف کے سلسلہ میں میں بھی اسی طرح کرتا جو عثمان نے کیا"۔ (مناہل العرفان ج ۱ ص ۲۵۵)

اعلان علی رضی اللہ عنہ: ابوبکر انباری نے سوید بن غفلہ سے روایت کی۔ انھوں نے فرمایا! "میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا اے لوگوں کے گروہ اللہ سے ڈرو۔ عثمان کے بارے میں حد سے نہ بڑھو اور انھیں مصاحف جلانے والا کہنے سے بچو۔ اللہ کی قسم آپ نے

مصاحف کو اصحاب رسول ﷺ کی جماعت کے مشورے کے سوا نہیں جلایا"۔ (مناہل العرفان ج۱ ص ۲۵۵، اتقان ص۶۱، فتح الباری ج۹ ص۱۷، عمدۃ القاری ج۲۰ ص۱۸)

جیسا کہ گذشتہ سطور سے یہ بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ جو مصاحف نذر آتش کیے گئے تھے وہ وہی تھے جو اصل نسخے کے خلاف قرأت منسوخہ، شاذہ اور غیر قرآن پر مشتمل تھے۔ اصل نسخہ قرآن کو نہیں جلایا گیا تھا بلکہ اسے رائج اور شائع کیا گیا تھا۔ لہٰذا دور عثمانی میں مصاحف کو جلانے کے اس عمل کو مقیس و مقیس علیہ میں مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کے پرانے نسخوں اور بوسیدہ اوراق کو جلانے کے سلسلہ میں نہ دلیل جواز بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی خلیفۂ رسول سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر کسی قسم کی تنقید و اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

تحقیر و استخفاف: گذشتہ تحریر کا تعلق اس امر کے ساتھ تھا کہ قرآن کے پرانے نسخوں اور بوسیدہ اوراق کی حفاظت کا بہترین اور زیادہ مؤدب طریقہ یہ ہے کہ انھیں دفنا دیا جائے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی بدبخت توہین کے پیش نظر قرآن مجید کے نئے یا پرانے نسخوں، بوسیدہ یا ناقابل استعمال اوراق کو گندی جگہ گرا یا جلا دیتا ہے تو اس کے بارے حکم شرعی کیا ہوگا؟۔

چنانچہ علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: "توجہ کی بات یہ ہے کہ جو شخص مصحف قرآن کریم یا اس کے جز کا استخفاف کرے یا ان کی اہانت کرے یا اس کے کل یا جز کا منکر ہو یا اس کی تکذیب کرے یا قرآن کریم کے کسی ایسے حکم یا خبر کو جھٹلائے جس کی تصریح اس میں موجود ہو یا ایسی چیز کو ثابت کرے جس کی قرآن کریم میں نفی موجود ہو یا ایسی چیز یا بات کی نفی کرے جو قرآن سے ثابت ہے اور مزید برآں یہ کہ وہ اس کو بخوبی جانتا بھی ہو۔ یا ایسے امور میں شک کرے تو ایسا شخص بالاجماع کافر ہے۔ (التبیان ص۸۴)

علامہ نووی اور امام ابن حجر ہیتمی فرماتے ہیں: "اگر کسی مسلمان نے والعیاذ باللہ قرآن مجید کو نجاست میں ڈال دیا تو ڈالنے والا کافر ہو جائیگا۔ (واللفظ للنووی التبیان ص۹۸، الزواجر ج۲ ص۳۳۹) واللہ ورسولہ اعلم۔

تحقیق وتحریر: فیصل خان☆

زبدۃ التحقیق کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسئلہ افضلیت شیخین جو کہ اہل سنت وجماعت کے مسئلہ عقائد کی قبیل سے تھا گذشتہ کچھ عرصہ سے اہل سنت کے بعض حلقوں میں متنازعہ فیہ کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ جیسا کہ اس مسئلہ پر جناب محترم قبلہ سید عبدالقادر جیلانی صاحب کی ''کتاب زبدۃ التحقیق'' کچھ عرصہ پہلے منظر عام پر آچکی ہے۔ محترم قبلہ شاہ صاحب نے اپنی کتاب زبدۃ التحقیق ص ۱۰۹ پر اپنا عقیدہ کچھ یوں سپرد قرطاس فرماتے ہیں۔

''ہمارا اپنا عقیدہ بحیثیت سنی کے جناب ابو بکر صدیق ؓ کے بارے میں بحیثیت خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برحق ہونے کے افضل الامت ہونے کا ہے۔ مگر ان صحابہ کرامؓ اور علماء امت کو سنیت سے خارج نہیں کیا جا سکے گا۔ جو ہماری اس رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔''

قبلہ محترم شاہ صاحب کا یہ موقف دو نکات پر مشتمل ہے کہ!

1: ان کا اپنا عقیدہ حضرت ابو بکر صدیق کا افضل الامت ہونے کا ہے۔

2: جن صحابہ نے ابو بکر صدیق کو افضل الامت نہیں مانا ان کو سنیت سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔

قبلہ محترم شاہ صاحب کے اس موقف کے دونوں پہلو کی تنقیح اور وضاحت تفصیل طلب ہے تا کہ معاملہ واضح اور آشکار ہو سکے۔ قبلہ محترم شاہ صاحب نے دعویٰ تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے افضل الامت ہونے کا کیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ زبدۃ التحقیق ص ۱۰۵ تا ص ۱۰۸ پر حضرت ابو بکر صدیق کے فضائل بیان کرنے کے بعد ص ۱۰۸ پر ان احادیث پر اعتراض بھی وارد کیے جس کی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر علماء اہل سنت نے دلیل قائم فرمائی ہے۔ مقصد واضح ہے کہ ایک طرف تو قبلہ شاہ صاحب زبدۃ التحقیق ص ۱۹۹ پر لکھیں کہ'' حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت بحیثیت خلیفہ راشد کے برحق ہے اور اس حیثیت سے آپ افضل الامت ہیں''۔ مگر ساتھ ہی ساتھ شاہ صاحب زبدۃ التحقیق میں حضرت ابو بکر کی افضلیت والی احادیث پر اعتراضات بھی وارد کرتے نظر آرہے ہیں۔

اہم نوٹ: میں محترم قبلہ سید عبدالقادر شاہ صاحب سے ادباً ایک سوال ضرور کروں گا کہ حضور آپ کے نزدیک اگر

حضرت ابوبکر صدیق افضل الامت ہیں تو آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ کیونکہ قبلہ شاہ صاحب نے زبدۃ التحقیق ص ۱۰۹ پر اس موقف کو "اپنا عقیدہ" لکھا ہے۔ اور میں یہ عرض کردوں کہ قبلہ شاہ صاحب نے خود زبدۃ التحقیق ص ۲۰۰ کے آخری سطر میں یہ لکھا ہے کہ "افضلیت تو باب عقائد کی چیز ہے۔ جس میں قطعیات کا ہونا ضروری ہے۔ اس عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عقیدہ افضلیت میں قطعیات کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا محترم قبلہ شاہ صاحب کو اپنا عقیدہ ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل قطعی پیش فرمانا ہوگی۔ کم از کم قبلہ شاہ صاحب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو افضل الامت کہنے کی کوئی قطعی دلیل تو پیش فرمائیں تاکہ معاملہ واضح ہو سکے۔

اب ہم محترم قبلہ شاہ صاحب کے موقف کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

محترم قبلہ شاہ صاحب کے موقف کے دوسرے پہلو کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ "کیونکہ افضلیت کے مسئلہ میں دیگر روایات مختلف صحابہ کرام سے دیگر صحابہ کرام کی افضلیت میں بھی موجود ہیں یعنی کچھ صحابہ کرام میں سے ایک صحابی نے حضرت زبیر بن العوام کو افضل کہا، کسی نے سیدہ فاطمۃ الزہراء کو افضل کہا، کسی روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود کو افضل کہا گیا کسی روایت میں ازواج مطہرات کو افضل کہا گیا ہے۔ الغرض قبلہ عبدالقادر شاہ صاحب نے ان متعدد اقوال اور روایات کی روشنی میں یہ اصول وضع کر دیا کہ اگر کوئی حضرت ابوبکر صدیق کو افضل نہ مانے تو اسے اہل سنت سے خارج نہیں کرنا چاہیے۔ اب اہل سنت سے کیوں خارج نہیں کرنا چاہیے۔ اس اصول کی بنیاد قبلہ محترم شاہ صاحب نے زبدۃ التحقیق ص ۲۵۴ پر کچھ یوں فرمائی ہے۔ "ان اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم سب صحابہ کرام" کو مینار ھدایت سمجھا جائے ان میں کسی کے قول کی بھی پیروی کی جائے تو موجب رشد و ھدایت ہوگی۔ محترم قبلہ شاہ صاحب زبدۃ التحقیق ص ۲۴۸ پر مزید لکھتے ہیں۔ "حاصل کلام یہ ہوگا کہ جب صحابہ کرام میں اجماع نہیں ہو سکا تو ان کے اقوال خلافیہ سے باہر نہیں جایا جا سکتا بلکہ ان میں سے کسی ایک قول کے اختیار کر لینے کی اجازت ہوگی۔ کیونکہ صحابہ کرام میں حق دائر ہے۔

نکتہ : قبلہ شاہ صاحب کے اس موقف میں بھی دو پہلو ہیں:

1: اجماع نہ ہو تو صحابہ کرام کے اقوال خلافیہ میں سے کسی ایک کے قول کو اختیار کرنا حق ہوگا۔

2: دوسرا پہلو یہ واضح ہوا کہ اگر اجماع ہو جائے تو پھر اقوال خلافیہ میں سے کسی بھی ایک قول کو اختیار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ یعنی جب اجماع منعقد ہو جائے تو اقوال خلافیہ میں سے کسی بھی قول کو اختیار کرنا غلط ہوگا اور ایسے تمام اقوال جو اجماع کے خلاف ہوں تو شاذ ہو کر ان سے استدلال باطل ہوگا۔ مگر اس کے برعکس قبلہ محترم شاہ صاحب زبدۃ التحقیق ص ۲۴۴ پر صحابہ کرام کے اختلاف کی وجہ سے اجماع افضلیت ابوبکر صدیق نہیں مانتے ہیں۔ قبلہ شاہ

صاحب لکھتے ہیں۔ ''جب اتنے اکابر کا اختلاف موجود تھا اور آج تک ہے تو پھر جناب ابوبکر صدیق کی افضلیت پر اجماع کیسے ہو سکتا تھا؟ لہٰذا قبلہ محترم شاہ صاحب کے دعویٰ کی تنقیح بہت اہم اور ضروری ہے۔ قبلہ شاہ صاحب کا یہ موقف بھی مضبوط نہیں ہے۔

اب ہم محترم قبلہ شاہ صاحب کے اس موقف کہ'' اصحابی کالنجوم ...... کسی کے قول کی بھی پیروی کی جائے تو جب رشد وھدایت ہوگی'' زبدۃ التحقیق ص ۲۵۴ کا ایک فکری اور تحقیقی نکتہ نظر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس سے قبل یہ بھی عرض کر دیں کہ محترم قبلہ شاہ صاحب نے جن جن روایات سے استدلال کرتے ہوئے دیگر صحابہ کرام وغیرہما کو بھی افضل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان روایات کی استنادی حیثیت بھی محل نظر ہے جس کی وضاحت کسی اور مقام پر بھی کر دی جائے گی۔ اور ان احادیث کے متعلق محققین جمہور علماء کرام ومحدثین نے جو کہا ہے وہ بھی منظر عام پر لائی جائیں گی۔ تاکہ عوام الناس پر یہ واضح ہو کہ مسئلہ افضلیت میں ضعیف حدیث یا روایات سے استدلال نہیں ہو سکتا ہے۔ اور کس طرح ان روایات جو نہ تو سنداً ثابت ہیں اور نہ ہی جن سے مدعا ثابت کیا جا سکتا ہے وہ پیش کر کے اجماع توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اصحابی کالنجوم کا تحقیقی مفہوم:

محترم قبلہ شاہ صاحب نے اقوال اختلافیہ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسئلہ افضلیت میں کسی بھی صحابی کا کوئی بھی قول در باب افضلیت میں اگر قبول کر لیا جائے تو وہ حق ہوگا اور اس طرح اہل سنت سے خارج نہ ہوگا۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ استنادی وفنی حیثیت سے در کنار حضرت عائشہ، حضرت فاطمۃ الزہراء، حضرت زبیر بن عوام وغیرہما کے فضیلت کے بارے میں بھی چند روایات قبلہ شاہ صاحب نے نقل کیں ہیں۔ اب ان روایات نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر ان مندرجہ بالا میں سے کسی صحابی کے قول کو بھی مان لیں تو وہ حق ہوگا اور اس موقف کی بنیاد اصحابی کالنجوم والی روایت بھی تھی۔ اب اس موقف پر اپنی رائے دینے سے بہتر ہے کہ قبلہ محترم قبلہ شاہ صاحب کے نزدیک معتبر حافظ ابن عبدالبر کی تحقیق پیش کر دی جائے تاکہ عوام الناس کو اس معاملہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ حافظ ابن عبدالبر ص ۴۶۳ھ لکھتے ہیں۔

اختلف الفقهاء في هذا الباب على قولين :

أحدهما: أن اختلاف العلماء من الصحابة ومن بعدهم من الأئمة رحمهم الله رحمة واسعة ، وجائز لمن نظر في اختلاف أصحاب رسول الله ﷺ أن يأخذ بقول من شاء منهم ، كذلك الناظر في أقاويل غيرهم من الأئمة ما لم يعلم أنه خطاء ، فاذا بان له

أنه خطأ الخلافة نص الكتاب أو نص السنة أو اجماع العلماء لم يسعه اتباعه فان لم يبين له من هذه الوجوه جاز له استعمال قوله ، وان لم يعلم صوابه من خطئه وصار في حيز العامة التي يجوز لها أن تقلد العالم اذا سألته عن شئ وان لم تعلم وجهه ، هذا قول يروى معناه عن عمر بن عبدالعزيز" والقاسم بن محمد و عن سفيان الثورى ان صح عنه ، وقال به قوم ومن حجتهم على ذلك قوله ﷺ: أصحابي كالنجوم فبأيهم اقتديتم اهتديتم " وهذا مذهب ضعيف عند جماعة من أهل العلم و قد رفضه أكثر الفقهاء وأهل النظر۔ (جامع البیان والعلم ۲/۹۵)

ترجمہ: اس باب میں فقہاء اسلام کے دو قول ہیں ایک یہ کہ صحابہ اور بعد کے ائمہ کا اختلاف رحمت و وسعت ہے اور یہ کہ ہر صحابی کے قول پر عمل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ائمہ کے مختلف اقوال میں سے جس قول کو لے لیا جائے جائز ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ کتاب وسنت کی نص صریح یا علماء امت کا اجماع اس کے خلاف موجود نہ ہو مگر علم سے بے بہرہ عوام کے لئے عالم کی تقلید بلا اختلاف جائز ہے۔ یہ قول عمر بن عبدالعزیز، قاسم بن محمد، سفیان ثوری وغیرہ علماء کرام کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ ان بزرگوں کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ السلام نے فرمایا: " میرے صحابی ستاروں کی طرح ہیں، جس کی بھی اقتداء کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔ لیکن اہل علم کا ایک بڑا طبقہ اس مذہب کو ضعیف قرار دیتا ہے اور اکثر فقہاء وعلماء نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ اب بات یہ ہے کہ پھر ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ اگر ایسے حالات کسی معاملہ میں پیدا ہو تو حافظ ابن عبدالبر نے اس کی وضاحت بھی فرمادی ہے۔

حافظ ابن عبدالبر مزید لکھتے ہیں! " وأما مالك والشافعي ومن سلك سبيلهما من أصحابهما ، وهو قول الليث بن سعد والأوزاعي وأبي ثور و جماعة أهل النظر: أن الاختلاف اذا تدافع فهو خطاء وصواب والواجب عند اختلاف العلماء طلب الدليل من الكتاب والسنة والاجماع والقياس على الأصول على الصواب ، منها وذلك لا يعدم فان استوت الادلة وجب الميل مع الاشبه بما ذكرنا بالكتاب والسنة فاذا لم يبين ذلك وجب التوقف ، ولم يجز القطع الا بيقين فان اضطر أحد الى استعمال شئ من ذلك في خاصة نفسه جازله ما يجوز للعامة من التقليد واستعمل عند افراط التشابه والتشاكل وقيام الادلة على كل قول بما يعضده قول رسول الله

" البر ما اطمأنت اليه النفس والاثم ما جاك في الصدر فدع ما يريبك الى ما لا يريبك " هذا حال عن لا ينعم النظر ويحسنه وهو حال العامة التي يجوز لها التقليد فيما نزل بها وأفتا بذلك علماؤها۔ (جامع البیان والعلم ۲/۹۲)

ترجمہ: امام مالک، امام شافعی، لیث بن سعد اوزاعی، ابوثور اور اہل نظر کی رائے یہ ہے کہ جب ایک ہی مسئلہ میں دو متضاد قول ہوں تو دونوں حق نہیں ہو سکتے۔ لازمی طور پر ایک صحیح ہوگا اور دوسرا غلط۔ ایسی صورت حال میں کتاب و سنت اجماع امت، اصول مسلمہ پر قیاس کر کے طلب دلیل ضروری ہے۔ اگر طرفین کے دلائل ہم پلہ ہوں اور راجح و مرجوح کا فیصلہ نہ ہو سکے تو جو قول کتاب وسنت سے زیادہ مشابہ ہو اس کی طرف مائل ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو سکوت وتوقف بہتر ہے قطعیت کے ساتھ کوئی حکم نہ لگایا جائے۔ اس قسم کے مسائل اگر اپنی ذات کو پیش آئیں تو عوام کی طرح تقلید جائز ہے از حد تشابہ اور تماثل کی صورت میں۔ مگر جب کوئی واضح پہلو سمجھ میں نہ آسکے تو اس حدیث شریف پر عمل کرنا چاہیے نیکی وہ ہے جس پر دل مطمئن ہو اور بدی وہ ہے جو دل میں کھٹک پیدا کرے جس بات میں تنگی محسوس کرے اسے چھوڑ دو اور جس میں دل کو خلش نہ ہو اسے لے لو لیکن یہ طریقہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو عوام کے درجے میں ہیں اور غور وفکر کی صلاحیت نہیں رکھتے ایسے لوگوں کو یقیناً علماء کے فتوی کی پیروی کرنا چاہیے۔ مگر جملہ علماء کا اتفاق ہے کہ قاضی اور مفتی کو قضاء وافتاء کے منصب اسی وقت قبول کرنا چاہیے جب کتاب وسنت اور اجماع امت سے کما حقہ واقفیت ہو اور بوقت ضرورت اجتہاد کی قابلیت بھی رکھیں۔

قارئین کرام! حافظ ابن عبد البر کے اس قول سے مندرجہ ذیل اہم نکات سامنے آتے ہیں۔

1: ایک ہی مسئلہ میں اگر دو متضاد یا متعارض اقوال ہوں تو دونوں حق نہیں ہو سکتے۔ صحیح صرف اور صرف ایک ہی قول ہوگا۔ اور ایسی صورت میں کتاب وسنت اور متفقہ اصولوں پر عمل ہوگا۔

2: اگر طرفین کے دلائل ایک جیسے یا ہم پلہ ہوں تو راجح اور مرجوح کی طرف جانا ہوگا۔ یعنی ایک قول راجح ہوگا اور دوسرا قول مرجوح ہوگا۔

3: اور اگر کوئی راجح اور مرجوح کا بھی فیصلہ نہ کر سکے تو قول کتاب وسنت سے زیادہ قریب اور مشابہ ہو تو اس کو لینا چاہیے کیونکہ مرجوح قول پر عمل کرنا غلط ہے۔

4: اگر کوئی قرآن وسنت کے مشابہ اقوال بھی نہ اخذ کر سکے تو پھر اس کو توقف کرنا چاہیے اور اس پر کوئی حکم نہ لگائے۔ کیونکہ اس شخص کو قرآن وسنت کے مشابہ اقوال ڈھونڈتے اور اخذ کرنے میں مشکل ہوگی اس لئے ایسے

شخص کو توقف کرنا ضروری ہے۔ اور اگر ممکن ہو تو پھر اس مسئلہ میں کسی بڑے عالم کی تقلید کرنی چاہیے۔

5: اور اگر کسی مسئلہ میں واضح پہلو سامنے نہ آئے تو جس طرف دل مائل ہو تو وہ قول اخذ کرنا چاہیے مگر یہ طریقہ صرف عام لوگوں کے لئے ہی ہے کیونکہ عوام الناس کے اندر غور و فکر کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ مگر صرف دل ہی کی نہ مانے بلکہ ایسی صورت میں علماء کے فتویٰ کی پیروی ضروری ہے۔ عام بندہ یہ نہ کرے کہ صرف دل جس طرف مائل ہو اس طرف طرف کا قول مانے بلکہ عالم کے فتویٰ کی پیروی کرے اور یہاں یہ بات اہم ہے کہ یہ معاملہ صرف اور صرف عوام یا جاہل لوگوں کیلئے ہے۔ علما حقانیہ کے احکامات تو اس سے جدا اور الگ ہیں جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔

6: آخری نکتہ یہ معلوم ہوا کہ عام یا جاہل آدمی کو کسی عالم کے فتویٰ پر عمل کرنا چاہیے مگر یہ بھی یاد رکھیں کہ فتویٰ بھی ہر شخص کا قابل قبول نہیں ہوتا۔ فتویٰ صرف اور صرف ان علماء کرام کا قابل قبول ہوتا ہے جس میں کتاب و سنت اور اجماع امت سے واقفیت اور عبور حاصل ہو اور اگر ضرورت پڑے تو اس میں اجتہاد کی قابلیت بھی ہو۔

7: حافظ عبدالبر کے قول سے یہ بھی واضح ہوا کہ اصحابی کالنجوم سے استدلال کرنا غلط ہے۔ کیونکہ کسی بھی صحابی کے کسی بھی قول کو اخذ کرنے سے ہدایت پانے والے مذہب کو ایک بڑے طبقہ اور جمہور علماء کرام نے ضعیف کہا اور فقہاء کرام نے اس موقف کو رد کر دیا۔

اب ان کو عوام الناس کے سامنے واضح کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسئلہ افضلیت میں قبلہ محترم شاہ صاحب نے بنیاد ہی اقوال متعارضہ اور اصحابی کالنجوم پر رکھی ہے۔ محترم قبلہ شاہ صاحب کا استدلال گذشتہ سطور میں واضح کر دیا ہے کہ ان کا استدلال یہ ہے کہ نصوص متعارضہ مسئلہ افضلیت میں صحابہ کرام سے وارد ہوئے ہیں اور صحابہ کرام کے نصوص متعارضہ میں سے کسی ایک نص یا قول پر عمل کرنے والا ہدایت اور حق پر ہوگا کیونکہ تمام صحابی ہدایت یافتہ ہیں اور کسی کے بھی ایک قول پر عمل کرنے یا ماننے سے اہل سنت سے خارج نہ ہوگا۔

1: مگر حافظ عبدالبر کے قول سے یہ واضح ہو گیا کہ دو متعارض اقوال میں سے حق ایک کے ہی ساتھ ہوگا۔ مطلب یہ کہ مسئلہ افضلیت میں نصوص متعارضہ میں سے کسی ایک ہی صحابی کا قول حق ہوگا اور اس مسئلہ میں استدلال صرف قرآن و سنت اور متفقہ اصولوں پر ہی ہوگا۔ اور مزید یہ کہ اصحابی کالنجوم سے استدلال بھی صحیح نہیں کیونکہ علماء کرام اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور بصورت دیگر اس حدیث سے مطلب پر عمل کرنے کو ضعیف مذہب قرار دیا ہے۔

2: محترم قبلہ شاہ صاحب کے پیش کردہ دلائل بالفرض اگر ہم پلہ بھی ہوں (مگر یہ یاد رکھیں کہ قبلہ شاہ صاحب کے پیش کردہ اقوال متعارضہ قوت میں ہم پلہ بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ قبلہ شاہ صاحب کے پیش کردہ دلائل میں سے

90% روایات ضعیف وموضوع ہیں جن کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ آئندہ پیش کیا جائے گا اور بقیہ 10% روایات بھی اپنے عموم پر نہیں اور استمکیات کی وجہ سے ان پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے مقابلے میں یہ باقی ماندہ روایات بھی ہرگز ہرگز ہم پلہ نہیں ہیں) تو پھر بھی ہمیں راجح اور مرجوح کی طرف جانا پڑے گا۔ اور یہ بات علماء کرام پر مخفی نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت راجح ہے اور مرجوح روایات پر عمل کرنے کا حکم بھی قبلہ شاہ صاحب کو معلوم ہے۔

۳: بالفرض کوئی بھی شخص مسئلہ افضلیت کے بارے میں راجح اور مرجوح کا فیصلہ نہ کر سکے تو قرآن وسنت کے زیادہ نزدیک مسئلہ کو ماننا پڑے گا۔ افضلیت ابوبکر صدیق قرآن وسنت کے زیادہ نزدیک ہے لہٰذا افضلیت ابوبکر صدیق کی ہی ماننا پڑے گی۔

۴: اگر کسی عالم کو مسئلہ افضلیت میں قرآن وسنت کے مشابہ اقوال بھی نہ مل سکے تو پھر بطور تنزل ایسے عالم کو توقف کرنا چاہیے۔ مگر اس توقف سے بھی کام نہیں چلے گا۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے سے بڑے عالم کی تقلید کر کے مسئلہ افضلیت کے بارے میں معرفت اختیار کرے۔

۵: اگر کسی عام بندے کو ایسے معاملہ یعنی مسئلہ افضلیت میں معاملہ واضح ہو تو وہ اپنے دل کی بات مانے یعنی دل جس طرف پر مطمئن ہو مگر یہ بھی یاد رکھیں یہ اس وقت ہے جب تک وہ کسی عالم کے فتویٰ پر آگاہ نہ ہو اور یہ بھی ذہن نشین رہے یہ معاملہ صرف اور صرف عوام الناس کے لئے ہے عالم پر ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

مزید یہ بھی ذہن نشین رہے کہ عام آدمی کسی کے فتویٰ پر عمل کر کے مسئلہ افضلیت پر عمل نہیں کر سکتا مسئلہ افضلیت میں بھی فتویٰ اس عالم کا قابل قبول ہوگا جس کو کتاب وسنت اور اجماع امت پر عبور حاصل ہو اور اس عالم میں اجتہاد کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہونی چاہیے۔

اس مندرجہ بالا تحقیق سے یہ واضح ہو گیا کہ افضلیت پر اقوال متعارضہ پیش کر کے اور چند علماء کرام کے توقف والے حوالے پیش کر کے اس مسئلہ میں عوام الناس کو الجھانا صریح غلط ہے۔ کیونکہ اول یہ کہ اقوال متعارضہ ہم پلہ نہیں ہیں اور اپنے استدلال میں واضح نہیں ہیں۔ لہٰذا ان سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ دوم توقف والے حوالے اگر بالفرض بطور تنزل مان بھی لئے جائیں (حالانکہ جن علماء کرام کا محترم قبلہ شاہ صاحب نے توقف کا مذہب نقل کیا ہے ان میں اکثر علماء کرام افضلیت ابوبکر صدیق کے قائل ہیں) تو پھر بھی یہ حوالے کار آمد نہیں کیونکہ حافظ ابن عبدالبر نے اختلافی مسئلہ میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ مختلف مراتب بیان کر دیے ہیں۔ کیونکہ جس طرح عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح ہر عالم کی معیار علمیت بھی جدا جدا ہوتی ہے۔

نکتہ: قارئین کرام اس مقام پر یہ یاد رکھیں کہ مسئلہ افضلیت پر بالفرض مختلف اقوال اور علماء کرام کا موقف مختلف ہو تو اس طرح کے معاملہ میں الجھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر عالم کی حیثیت دوسرے عالم سے مختلف ہوتی ہے اور ان تمام کا معیار علم اور مطالعہ بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ اگر کسی کے مطالعہ میں مسئلہ افضلیت اجماعی ہے تو اس نے مسئلہ افضلیت کو اجماعی لکھا۔ اگر کسی کے علم میں ایسے معاملہ میں توقف پہلے آ گیا تو اس نے اس مسئلہ پر توقف کیا۔ مگر یہ بھی یاد رکھیں کہ ان میں ہر کسی کے قول پر عمل کرنا جائز نہیں کیونکہ جاننے والے کو نہ جاننے والے پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

مزید یہ بھی ذہن نشین رہے کہ محترم قبلہ شاہ صاحب نے جن اقوال متعارضہ سے استدلال کیا ہے ان کی سند اور متن بھی محفوظ نہیں اور یہ کہ ان اقوال سے تعارض ثابت بھی نہیں ہوتا۔ ان اقوال تعارض کی حقیقت ان شاء اللہ اگلے مضمون میں بطور احسن واضح کر دی جائے گی۔ اور محترم قبلہ شاہ صاحب کو تعارض ثابت کرنے کے لئے بھی کم از کم دس وجوہات اصول کی روشنی میں بیان کرنا پڑیں گے۔

صرف تعارض کہہ دینے سے تعارض ثابت نہیں ہوتا جس طرح حدیث کو صحیح کہہ دینے سے حدیث صحیح نہیں ہوتی بلکہ اصول اسماء الرجال کی روشنی میں راویوں کی توثیق کر کے حدیث صحیح ہوتی ہے۔ لہٰذا محترم قبلہ شاہ صاحب کو تعارض کی شرائط بیان کر کے ان شرائط پر تعارض کو ثابت کرنا پڑے گا۔ لہٰذا مسئلہ افضلیت خالصتاً علمی مسئلہ ہے جس شخص کے سامنے جس طرح کے دلائل آئے اس نے اسی طرح کا حکم بھی لاگو کیا اور جس طرح کا علمی معیار کسی عالم کا ہو اس نے اسی علمی معیار کے مطابق مسئلہ افضلیت کو بیان کیا۔ جس طرح علماء کرام کا علمی اور تحقیقی معیار میں فرق ہے۔ اس طرح ان کے اقوال اور وضع کردہ اصول وضوابط کی حیثیت بھی الگ اور جدا ہوگی۔ امام اعظم کے مقابلے میں امام کرخی یا علامہ بدرالدین عینی کا قول ہرگز ہرگز قابل قبول نہ ہوگا کیونکہ امام اعظم مجتہد مستقل مطلق ہیں اور ان کی حیثیت اور رتبہ علمی لحاظ سے کافی بلند ہے۔ لہٰذا امام اعظم کے قول کو فوقیت حاصل ہوگی۔

لہٰذا محترم قبلہ شاہ صاحب کا اس مسئلہ میں عوام الناس کو الجھانا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مسئلہ افضلیت میں متواتر احادیث، نصوص، اجماع اور جمہور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر ہیں ان میں سے محترم قبلہ شاہ صاحب کو کم از کم جمہور کا تو اعتراف ہے۔ ان شاء اللہ ہم افضلیت ابوبکر صدیق پر متواتر احادیث، نصوص اور اجماع بھی اپنی کتاب میں نقل کریں گے تاکہ عوام الناس پر مسئلہ واضح ہو سکے۔

مناسب ہوگا کہ محترم قبلہ شاہ صاحب کے موقف کی بنیاد (کہ صحابہ کرام میں اگر اختلاف ہو تو کسی بھی صحابی کے قول اختیار کرنے سے آدمی اہل سنت سے خارج نہ ہوگا اور ہدایت یافتہ ہوگا) پر مزید صحابہ کرام وتابعین وتبع

تابعین علماء اہل سنت کے اقوال سے وضاحت کر دی جائے تاکہ کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔

اختلاف صحابہ اور لیث: قال يحيى: وبلغني أن الليث بن سعد قال: اذا جا الاختلاف أخذنا فيه بالأحوط (جامع البيان والعلم:١٦٩٦)

ترجمہ: امام لیث بن سعد کہا کرتے تھے، صحابہ کے اختلاف میں جو پہنچتے ہیں تو ہم زیادہ محتاط قول کو لیتے ہیں۔

اختلاف صحابہ کرام اور امام مالک: أخبرنا عبد الرحمن بن يحيى ثنا احمد بن سعيد ثنا محمد بن زبان ثنا الحارث بن مسكين عن ابن القاسم عن مالك أنه قال في اختلاف أصحاب رسول الله ﷺ مخطئ و مصيب، فعليك بالاجتهاد۔ (جامع البيان والعلم: ١٦٩٧)

ترجمہ: امام مالک نے فرمایا صحابہ میں بعض حق پر تھے اور بعض سے غلطی ہوئی، اس لئے ان کے افعال پر کھا کرو۔

اختلاف صحابہ کرام اور قاضی اسماعیل بن اسحاق: وذكر اسماعيل بن اسحاق في كتابه "المبسوط" في اجتهاد الرأي فأما أن يكون توسعة لأن يقول الناس واحد منهم عن غير أن يكون الحق عنده فيه فلا، ولكن اختلافهم يدل على انهم اجتهدو فاختلفوا قال ابو عمر: كلام اسماعيل هذا حسن جداً،

ترجمہ: قاضی اسماعیل بن اسحاق نے کہا: صحابی کے اختلافات عمل میں سہولت و وسعت پیدا نہیں کرتے البتہ اجتہاد کی راہ کشادہ کرتے ہیں آدمی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ صحابی کی غلطی لے کر بیٹھ جائے اور کہے یہ صحابہ کا عمل ہے۔ البتہ ان کے اختلاف سے یہ نتیجہ نکالنے کا حق ضرور ہے کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ قاضی اسماعیل کا یہ قول بالکل درست ہے۔

نوٹ: یہاں یہ بات اہم ہے کہ اختلاف میں دونوں روایات کا صحیح اور متعارض ہونا ضروری ہے کیونکہ ضعیف روایت یا وہ روایت جو اپنے عموم پر نہ ہو تو ایسی روایات کس طرح دیگر روایت سے متعارض ہو سکتیں ہیں۔

اختلاف صحابہ اور امام مالک: سماع أشهب: سئل مالك عمن أخذ، بحديث حدثه ثقة عن أصحاب رسول الله ﷺ أتراه من ذلك في سعة؟ فقال: لا والله حتى يصيب الحق وما الحق والصواب الا واحد۔ (جامع البيان١٧٠٠)

ترجمہ: اشہب کی روایت ہے کہ امام مالک سے سوال کیا گیا "اگر ثقہ راوی ایک ہی مسئلہ میں صحابہ سے دو مختلف قول روایت کرے تو کیا ہر قول پر عمل کرنا ٹھیک ہے؟ امام مالک نے جواب دیا: بخدا نہیں بلکہ جو قول حق ہو اسے

کہا جا چکا ہے اور حق ایک ہی ہو سکتا ہے دونوں متضاد قول حق نہیں ہو سکتے۔

اختلاف صحابہ اور امام شافعی: أخبرنا احمد بن عبدالله بن محمد، ثنا الميمون بن حمزة الحسيني بمصر ثنا ابوجعفر الطحاوي ثنا ابوابراهيم اسماعيل بن يحيى المزني۔ قال الشافعي اختلاف أصحاب رسول الله ﷺ أصير فيهما الى ما وافق الكتاب أو السنة اوالاجماع أو كان أصح في القياس، وقال في قول الواحد منهم، اذا لم يحفظ له مخالفا منهم صرت اليه وأخذت به اذا لم أجد كتاباً ولاسنة ولا اجماعاً ولا دليلاً هذا وجدت معه القياس قال: وقل ما يوجد ذلك (جامع البيان والعلم ۲۰۲/۱)

ترجمہ: امام شافعی نے کہا: میں اختلاف کی صورت میں اس صحابی کا قول لوں گا جو کتاب وسنت واجماع امت کے موافق یا قیاس کی کسوٹی پر کھرا اترے گا اگر کسی مسئلے میں ایک ہی صحابی کا قول ہے اور اس کے خلاف کوئی قول موجود نہیں تو اسے لے لوں گا مگر شرط یہ ہے کہ کتاب وسنت واجماع کے خلاف نہ ہو اور قیاس پر بھی پورا اترے مگر ایسی صورت شاذ ہی پیش آتی ہے۔

نوٹ: امام اعظم کا اختلاف صحابہ کرام میں دو قول ہیں۔ ایک قول امام شافعی کے ہم معنی ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ میں جس صحابی کا قول بھی لے لوں، درست ہے اجماع صحابہ سے خروج میرے نزدیک مناسب نہیں تابعین اور دوسرے لوگوں کی جانچ پڑتال کو ضروری سمجھتا ہوں۔ مگر امام اعظم کا یہ قول بھی محل نظر آتا ہے کیونکہ امام اعظم سے مشہور یہ ہے کہ وہ صحابہ کرام اور احادیث میں اختلاف کے وقت فقیہ صحابہ کی حدیث پر عمل کو ترجیح دی۔ امام اعظم مجتہد مستقل مطلق تھے ان کا یہ مقام تھا کہ وہ کسی بھی صحابی کے قول کو لے سکتے تھے۔ مگر عرض یہ ہے کہ یہ حق اور مقام صرف اور صرف امام اعظم کو ہی حاصل ہے ہر کسی کو یہ مناسب نہیں کہ وہ کسی بھی صحابی کا قول لے۔ کیونکہ مجتہد کو ہی ناسخ والمنسوخ، راجح ومرجوح وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔

قارئین کرام کے لئے یہ عرض کر دوں کہ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو افضل سمجھتے تھے۔ لہذا امام اعظم کے قول سے بھی راہ نکالنی مشکل ہے۔ یہ یاد رہے کہ مجتہد مطلق کو یہ اصولاً حق حاصل ہے کہ وہ صحابہ کرام کے کسی بھی قول کو لے مگر یہ بھی یاد رہے کہ مجتہد بھی کسی مسلمہ اصول کے تحت کسی ایک صحابی کے قول کو لیتا ہے۔ بے اصولی تو ان کے ہاں بہت ہی مشکل ہے۔ اگر کسی مجتہد نے اگر کسی ایک صحابی کا قول لیا تو وہ اس کے اصول وضوابط بھی بتائے گا۔

قارئین کرام!! اگر آپ احادیث کا بغور مطالعہ کریں تو متعدد مقامات ایسے موجود ہیں جہاں صحابہ کرام کا ایک

دوسرے سے اختلاف ہوا۔ مگر مطالعہ میں یہ بات آئی کہ انہوں نے حق کو ہمیشہ واضح کیا اور دوسرے صحابہ کرام نے اس حق کو قبول بھی کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے کہ "یہ میری رائے ہے اگر صحیح ہو تو خدا کی توفیق ہے اور اگر غلط تو میری کوتاہی ہے۔ میرے مطالعہ میں ایسے بہت سارے واقعات وقوع پذیر ہوئے ہیں کہ صحابہ کرام کے آپس میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہوا اور انہوں نے ایک کو حق پر اور دوسرے کو خطا پر سمجھا اگر ایسا نہ ہوتا تو ان میں ہر صحابی دوسرے صحابی کو کہتے کہ میرا قول بھی حق ہے اور تیرا قول بھی حق ہے ہم دونوں ہدایت کے ستارے ہیں اور اختلاف کی وجہ سے ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ ہم اس بات کو واضح کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کرتے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لئے ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

1: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین عرب کے بارے میں تمام صحابہ کا قول رد کر دیا تھا اور فرمایا تھا اگر عرب وہ سب ادا نہیں کرتے جو رسول اللہ ﷺ کو ادا کرتے تھے تو ان میں ان پر جہاد کروں گا۔ (بخاری ۱۴۲، مسلم ۲۳۸۰)

2: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے اختلاف کرتے ہوئے تکبیرات جنازہ پر صرف چار تکبیر پر مجبور کیا۔ (بخاری رقم: ۱۲۸۳ تا ۱۲۸۵، مسلم ۲۰)

3: اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے سنا کہ حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ عورت کے سامنے آجانے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے تو تردید کی اور فرمایا: میں درمیان میں لیٹی ہوتی تھی اور رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے۔

4: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عمرے کئے تھے تو حضرت عائشہ نے مخالفت کی اور فرمایا: عبداللہ، رسول اللہ ﷺ کے تمام عمروں میں ساتھ تھے مگر بھول گئے ہیں۔ حضور نے چار نہیں بلکہ تین عمرے کئے تھے۔ (صحیح بخاری، ۳۲۵)

5: حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے مرتدوں کو قتل کے بعد جلوا دیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس عمل پر انکار کیا۔ (مسند ابی یعلی ۲۵۳۲، ابن حبان ۵۶۰۶، بخاری ۱۹۲۲، مسند احمد ۱/۲۸۲)

6: اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس کو معلوم ہوا کہ حضرت علی عرب عیسائیوں کا ذبیحہ کھانے سے منع کرتے اور فرماتے ہیں: "انہوں نے نصرانیت میں سے اگر کچھ لیا ہے تو شراب خوری ہے۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے کہا بلکہ ان کا ذبیحہ کھانا روا ہے۔

7: اسی طرح ایک مسئلہ میں حضرت فاروق اعظم نے اپنی رائے چھوڑ کر حضرت معاذ بن جبل کی رائے کی طرف

رجوع کیا اور فرمایا معاذ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتے۔ (سنن الدارقطنی رقم: ۳۸۱، مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۹۳۰۸)

اس مندرجہ بالا تحقیق سے واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام نے بھی حق کی دلیل کو مانا اور یہ نہ کہا کہ میں بھی ہدایت پر ہوں اور تو بھی ہدایت پر ہے۔ لہذا یہ موقف اختیار کرنا محل نظر ہے کہ صحابہ کرام کی جس حدیث کو بھی لیں جائز ہو تو صحیح ہوگا۔

عالموں کے دو متضاد اقوال پر عمل کی تحقیق:

ہمارے اس دور میں یہ بات بڑی ہی عجیب اور اصولوں کے خلاف ہے کہ مسئلہ افضلیت میں فلاں کا قول فلاں سے مختلف یا متعارض یا متضاد ہے تو پھر اس پر کیا حکم لگاؤ گے۔ کیا مسئلہ افضلیت ابو بکر صدیق پر ان علماء کرام کو اہل سنت سے خارج کر دو گے۔ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ فتویٰ دینا تو فقیہ کا کام ہے ہر عالم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ فتویٰ لگائے کیونکہ اگر مفتی کی شرائط پر دیکھیں تو آج کے دور میں شاید ہی کوئی آپ کو مفتی نظر آئے سوائے چند شخصیات کے۔ لہذا مسئلہ افضلیت پر مابین فریقین جو ناصبیت، خارجیت اور رافضیت کی فتویٰ بازی ہو رہی ہے وہ قواعد و ضوابط اور مسلمہ اصول کے سراسر خلاف ہے۔ لہذا اس قسم کی فتویٰ بازی سے گریز کرنا چاہیے مزید یہ عرض کر دوں کہ فتویٰ ایسے شخص پر لاگو ہوتا ہے جس کی نظر میں تمام دلائل اور ثبوت ہو اور پھر وہ اس کا انکار کرے۔ اگر کسی کی نظر یا مطالعہ میں دلائل ہی نہ ہو تو اسکے موقف پر فتویٰ لگانا بڑی جرأت کا کام ہے اور وہ اس مسئلہ پر ماجور سمجھا جائیگا۔ اب اس مسئلہ افضلیت میں جس عالم کے مطالعہ میں جس قسم کے دلائل تھے انہوں نے اس مسئلہ افضلیت پر اسی قسم کا موقف اختیار کیا، یہ بات سمجھنے کی ہے کہ علماء کرام اور مجتہدین کے بھی مراتب ہیں۔ لہذا ان مراتب کا خیال رکھتے ہوئے ان کے اقوال کو پرکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بعض عالم کسی ایک فن کا ماہر ہوتا ہے تو دوسرا کسی دوسرے فن کا ایک عالم علم تفسیر کا ماہر ہوگا تو دوسرا علم حدیث کا، ایک عالم منطق کا ماہر ہوگا تو دوسرا فلسفہ کا، اور ان تمام عالموں سے مجتہد کی شان اور فضیلت سب سے بڑھ کر ہے اور مجتہد کے بھی کئی مراتب ہیں۔

اقوال متضاد اور امام مزنی: امام مزنی شاگرد رشید امام شافعی کا دو علماء کے متضاد اقوال کے بارے میں قول ملاحظہ کریں! "لم تصنع هذا الرأى العالمين المختلفين ؟ فتثبت منهما ما أشبهه الدليل وتبطل ما أبطله الدليل" (جامع البیان العلم ۲/۱۱۵)

ترجمہ: تو اختلاف رکھنے والے دونوں عالموں کے اقوال سے بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کرتے؟ جو قول دلیل سے صحیح ثابت ہو جائے اسے لے لو اور جو باطل ٹھہرے اسے چھوڑ دو۔"

حافظ ابن عبد البر کا فیصلہ: امام مزنی کے اس قول پر حافظ ابن عبد البر کچھ اس انداز میں فیصلہ وارد کرتے ہیں!''

ما ألزمه المزني عندي لازم'' (جامع البیان العلم ۲/۱۱۵)

یعنی امام مزنی کا استدلال بالکل درست ہے اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ علماء کرام کے متعارض اقوال میں سے ایک کا قول قرآن وسنت اور آثار کی روشنی میں اخذ کرنا ضروری ہے۔

حدیث أصحابي کالنجوم کا تحقیقی جائزہ: محترم قبلہ شاہ صاحب کے موقف کی بنیاد حدیث اصحابی کالنجوم کا بھی قارئین کرام کے لئے مختصراً جائزہ پیش خدمت ہے۔

1: امام مزنی حدیث اصحابی کالنجوم کے بارے میں لکھتے ہیں:'' ان صح هذا الخبر فمعناه! فيما نقلوا عنه وشهدوا به عليه فكلهم ثقة مؤتمن على ما جاء به لايجوز: عندي غير هذا وأما ما قالوا فيه برأيهم فلو كانوا عند أنفسهم كذلك ما خطا بعضهم بعضاً ولا أنكر بعضهم على بعض ولا رجع منهم أحد الى قول صاحبه فتدبر'' (جامع البیان العلم ۲/۱۱۶)

ترجمہ: امام مزنی نے حدیث اصحابی کالنجوم کی تشریح میں کہا ہے اگر یہ حدیث صحیح ہے (جو کہ ضعیف ہے) تو معنی یہ ہیں کہ روایت دین میں تمام صحابی ثقہ اور معتبر ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی معنی میرے نزدیک درست نہیں کیونکہ اگر خود صحابہ اپنی رائے کو ہمیشہ صائب اور غلطی سے مبراء سمجھتے ہوتے تو آپس میں ایک دوسرے کی تغلیط کرتے اور نہ کبھی اپنے کسی قول سے رجوع کرتے، حالانکہ بے شمار موقعوں پر صحابہ کرام ایسا کر چکے ہیں۔

2: محدث بزار حدیث اصحابی کالنجوم کے بارے میں لکھتے ہیں:'' هذا الكلام لا يصح عن النبي ﷺ'' (جامع البیان العلم ۲/۱۱۶) یعنی یہ کلام (اصحابی کالنجوم) نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس روایت میں راوی ضعیف ہیں مگر طوالت کی وجہ سے اس مقام پر صرف محدث بزار کا حوالہ نقل کر دیا ہے۔ اگر کسی نے اس حدیث پر کلام کیا تو ان شاء اللہ تفصیلی گفتگو ہوگی۔

مزید یہ کہ محدث بزار نے حدیث اصحابی کالنجوم کو صحیح حدیث عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين بعدي کے بھی خلاف لکھا ہے۔ (جامع البیان العلم ۲/۱۱۷)

نتیجہ: قارئین کرام! اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ اگر کسی مسئلہ میں نصوص یا اقوال متعارض ہوں تو دلائل کی روشنی میں ایک ہی کو ترجیح ہوتی ہے اور یہ کہ حدیث اصحابی کالنجوم ہی ضعیف ہے۔ لہٰذا محترم قبلہ شاہ صاحب کا اپنی کتاب زبدۃ التحقیق میں اقوال متعارضہ در باب افضلیت میں نقل کر کے یہ ارشاد فرمانا کہ ان اقوال میں سے کسی ایک کا

(بقیہ صفحہ ۹۹ پر)

تبصرہ نگار: افضل شاہد اعوان

تعارف و تبصرہ کتب

تبصرہ کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا کتاب کے مضمون سے کلی طور پر متفق ہونا ضروری نہیں۔

۱) مقالات سلطانیہ

مصنف: شیخ الاسلام خواجہ حافظ سلطان محمود دریاوی مدظلہ العالی

صفحات: ۲۸۳ ہدیہ: ۱۵۰

ناشر بزم سلطانیہ (0300-5193811۔ صاحبزادہ محمود احمد)

شیخ طریقت حضرت علامہ حافظ سلطان محمود دریاوی دامت برکاتہم العالیہ سجادہ نشین آستانہ عالیہ دریائے رحمت شریف حضرو ضلع اٹک کو اللہ تعالیٰ نے یہ وصف عطا فرمایا ہے کہ آپ خانقاہی ذمہ داریاں بحسن وخوبی سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ دینی کتب کے مطالعہ اور مختلف متنازعہ مسائل کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں۔ پیر صاحب قبلہ نے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ نے نہ صرف تقریر میں بدعقیدہ لوگوں کا رد کیا ہے بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مسائل پر علمی تحقیقی کتابچے اور اشتہارات بھی شائع کیے ہیں۔ جن میں آپ نے انتہائی مختصر انداز میں مسلک حق کو مخالفین پر واضح کیا ہے۔ ان رسائل و اشتہارات کے مطالعہ سے آپکے وسیع المطالعہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب "مقالات سلطانیہ" حضرت پیر صاحب کے مختلف ادوار میں شائع ہونے والے کتابچوں اور اشتہارات کو مزید اضافوں اور تخریج کے ساتھ "مقالات سلطانیہ" کے نام سے دوبارہ یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔ یہ مقالات انتہائی تحقیقی اور معلومات افزا ہیں۔ یہ کتاب علماء اور عوام دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

۲) مفتاح الجنۃ

مصنف: آغا حسن بلال درانی کریمی (0332-8989271)

صفحات: ۱۰۰ ہدیہ: دعائے خیر ناشر: دربار کریمی لوسر میرا اوا کینٹ

بنیادی طور پر یہ کتاب فرمودات و معمولات کریمیہ پر مشتمل ہے۔ اس میں فلسفہ طریقت و شریعت، عصر حاضر کے مسلمانوں کے جملہ مسائل کا حل، نماز تہجد، کریمیہ سلسلے کا وظیفہ، فضیلت ذکر، فضیلت درود پاک، ختم کریمی، ختم خواجگان اور شجرہ نقشبندیہ مجددیہ کریمیہ کے علاوہ ضمناً کئی دوسرے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳) مولود کعبہ کون؟

مصنف: علامہ قاری محمد لقمان (0300-6235167) صفحات: ۸۰ ہدیہ: ۵۰

ناشر: دارالتحقیق جامعہ محمدیہ فاروقیہ رضویہ شادیوال گجرات

۴) سوئے حجاز یا سوئے ایران

تحریر: صاحبزادہ محمد ضیاء الحق قادری رضوی

صفحات: ۲۴ ناشر: مرکزی جماعت اہل سنت تحصیل گوجرخان

ملنے کا پتہ: مکتبہ غوثیہ مہریہ رضویہ میلاد چوک گرمنڈی مین بازار گوجرخان

۵) پیر سید مہر علی شاہ اور تحریک خلافت

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد علیہ الرحمہ

صفحات: ۳۲ ہدیہ: ۱۵ روپے کے ڈاک ٹکٹ

ملنے کا پتہ: ادارہ مظہر اسلام ۶۲/۳ نئی آبادی مجاہد آباد مغل پورہ لاہور پوسٹ کوڈ ۵۴۸۴۰

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆